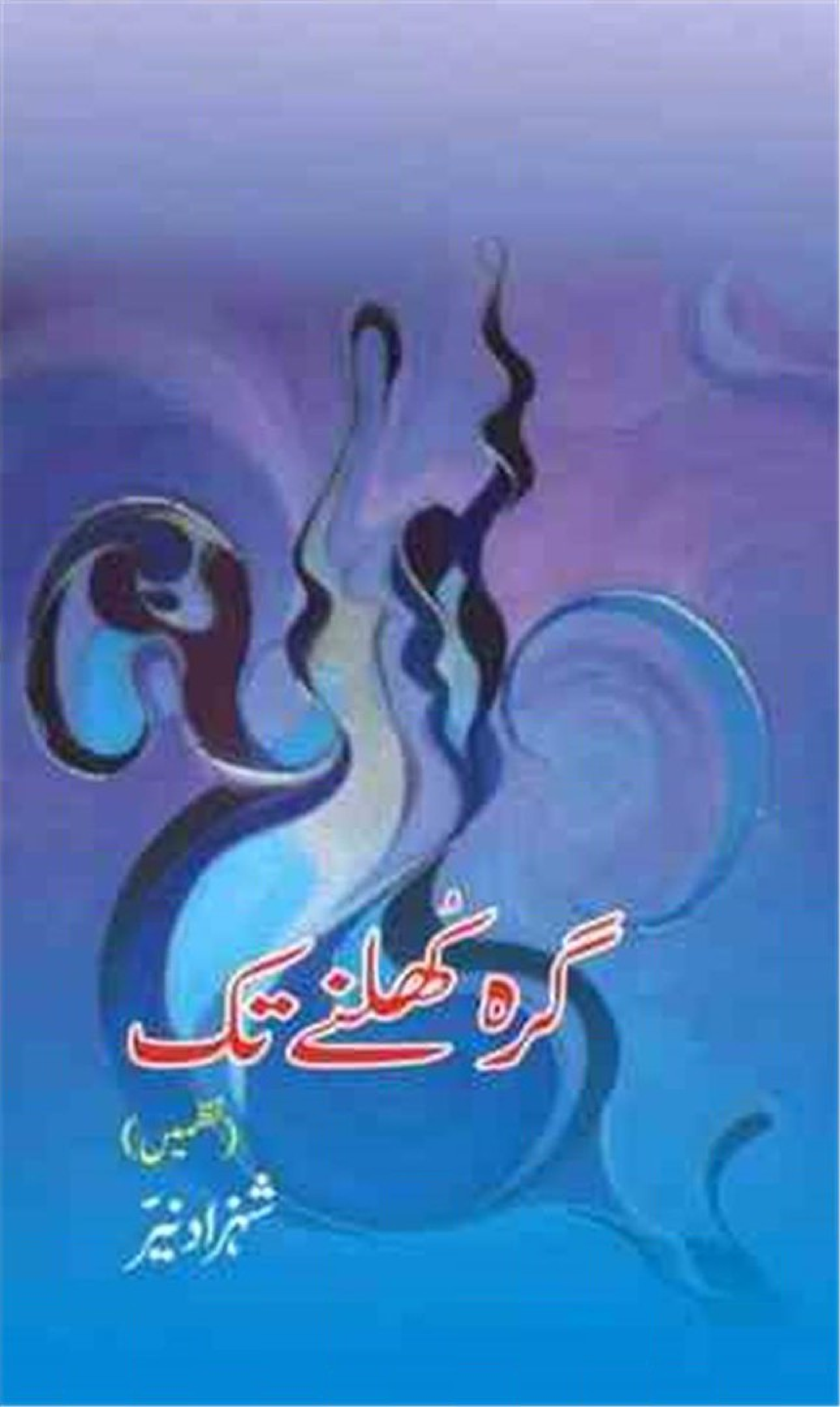

گرہ کھلنے تک
(نظمیں)
شہزاد نیر

محوِ آئینہ داری

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

گِرہ کُھلنے تک

زمینِ حُسن بھی شق تھی، سپہرِ عشق بھی شق
یہاں کسی سے نہ میری نظر کا بار اُٹھا

گرہ کھلنے تک

نظمیں

شہزاد نیّر

بک کارنر
جہلم، پاکستان

Girah Khulnay Tak
by Shahzad Nayyar
Jhelum: Book Corner. 2019
144p.
1. Poetry
ISBN: 978-969-662-172-0

اشاعتِ اوّل: 2013ء

اشاعتِ دوم: 2016ء

اشاعتِ سوم: 2019ء

نام کتاب: گرہ کھلنے تک

شاعر: شہزاد نیّر

پس ورق تصویر: عرفان چودھری

سرِ ورق: ابو امامہ

ناشر: گگن شاہد، امر شاہد

مطبع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

BC

BC

بُک کارنر

شورُوم: اقبال لائبریری روڈ، بک سٹریٹ، جہلم (پاکستان)
Ph: +92 (544) 614977, 621953 Email: info@bookcorner.com.pk
WhatsApp # 0321-5440882 Facebook: book corner showroom

WWW.BOOKCORNER.COM.PK

زمین کے اُن باسیوں کے نام

جو

آسمان کی خاطر قتل کر دیے گئے

کِس کی مانُوں کہ سب یقیں والے
اپنے اپنے گُماں سے کہتے ہیں

فہرست

ساختیات

(پیش لفظ)

سخت ابجد کی نوکوں نے گھایل کیا
بے لچک شکل آواز یکسر اٹل
اوّلیں لوح کی آمرانہ کتابت سے نکلی ہوئی
جبر تختی کے سب حرف اوروں کے لفظوں میں جُڑتے رہے
جن کو ہل ہل کے میں یاد کرتا رہا
لفظ میرے شکاری
قبیلے سے ہٹ کر کوئی لفظ سُنتے ...... جھپٹتے
مری خلق کرنے کی طاقت کُچلتے
مجھے سننے والوں کے بھی دانت باہر نکلتے

کسی نے نہ پوچھا
میں کس لفظ سے کیا بنانے
کسی چیز کو کیا بُلانے کی چاہت میں گھلتا تھا
کس کو خبر ہے کہاں کیا سجاتا
کسے کیا بلاتا
زمیں کا فلک نام رکھتا
فلک چیر کر سبز روٹی اُگاتا
بڑے فخر سے پاؤں رکھتا فلک پر!
سبھی نام مرضی سے رکھتا
گنہ کو نگہ سے ہٹاتا
کبھی بَین کو بِین میں نہ لگاتا
سعادت کو عادت بنا کر عبادت بناتا
درُشتی، درُستی سے کچھ دُور رکھتا
خبر، خیر کرتا
کہیں جُل کو جَل میں سمانے نہ دیتا
میں تاریخ کے پاس تاخیر آنے نہ دیتا
ادب کو ابد نام دیتا
ابد کو مٹاتا

خدا کو نہ خود سے جدا کر کے لکھتا
خود آ، خود کو خود ہی خدا کر کے لکھتا
کہاں کیا لگا تا
یہ کس کو خبر ہے
مگر سر پہ لا دے گئے
عہدِ خاموش کا جبر توڑ وں
تو میں لفظ باہر
میں اب کس زباں میں کہوں سب
جو میں چاہتا تھا...

ہدایت کار

نہیں یہ زاویہ اچھا نہیں
آؤ اِدھر سے روشنی ڈالو
وہی منظر اُجاگر ہو جو میں نے سوچ رکّھا ہے
اُٹھاؤ کیمرا، آگے بڑھو دیکھو!
فقط اُتنا دِکھاؤ جس قدر میں چاہتا ہوں
کیا؟
ارے لِکّھا ہوا ایسے نہیں پڑھتے
اداکاری تو ایسی ہو
کوئی بھی دیکھنے والا نہ یہ سمجھے
کہ جو کرتے ہو وہ پہلے سے لکّھا جا چکا ہے
دیکھ لو، جینے کی نوٹنکی تو مرنے سے بھی مشکل ہے
ذرا مر کر دکھاؤ...... کٹ!

یہ مرنا ہے؟
ارے اس میں ذرا سی جان تو ڈالو
گذشتہ بھول جاؤ سب
وہی دیکھو جو میں آگے دکھاتا ہوں
مری ہر ''سین'' پر نظریں ہیں
کب کتنا چھپانا ہے
کہاں کتنا دکھانا ہے
کہانی کو کدھر سے موڑ دینا ہے
پرانی داستاں اندر یہ منظر کس جگہ پر جوڑ دینا ہے
یہ سب کچھ جانتا ہوں میں
تُمھارا کیا؟ ذرا سے بیچ کے کردار ہو تم سب
تو بس اتنی غرض رکھّو
کہاں آغاز تھا انجام کب ہوگا
تمھیں پوری کہانی سے کوئی مطلب؟
تمھیں تو جلد ہی میں مار ڈالوں گا
کہانی کار بھی میں ہوں!

سقراط

پتھر کاٹنے والے کو معلوم نہیں تھا
اپنا آپ ہی سب سے بھاری پتھر ہے
جسم کا پتھر کٹ جائے تو رستہ بہتر کٹ جاتا ہے
ڈھیروں پتھر کاٹ کاٹ کے
وہ روز و شب کاٹ رہا تھا
اُس کو یہ معلوم نہیں تھا اُس کا بیٹا
پھٹی ہوئی پوشاک میں چھپ کر
ایسا مرمر کاٹ رہا تھا
جس کے کٹتے ہی زنجیریں کٹ جاتی ہیں
جو کہتا تھا
سارے رستے اپنے اندر سے آتے ہیں
راہیں کھولو، پتھر کاٹو، اپنا آپ تراشو

تم اپنی تعظیم کے رُخ سے دیکھ کے دیکھو
تم اُونچے ہو اور خداؤں والا پربت نیچا ہے!
اَن جانے میں مانتے جانے سے اچھّا ہے کچھ مت مانو
بِن جانے کچھ مانتے ہو تو عقل پہ پتھر پڑ جاتے ہیں!
وہ کہتا تھا
وقت کے گہرے سنّاٹے سے
تُند سوال کا اِک کنکر ٹکرا جائے تو
لاکھ جواب اُبھر آتے ہیں
دیکھتے دیکھتے مٹ جاتے ہیں
ایک سوال نہیں مٹتا ہے!
اور پھر اک دن
پتھر آنکھیں دیکھ رہی تھیں
سنگ تراش کا بیٹا
اِک آتش سیّال کی دھار سے
اپنے آپ کو کاٹ رہا تھا
لاکھوں رستے بہہ نکلے تھے

تجسّس گرہ کھولتا ہے

ترے روبرو لب کُشائی روایت کا حصّہ نہیں
حکمِ لب بستگی تجھ سے منقول تھا
سو، مری پُستکوں میں
مناہی شدہ منطقوں کا کہیں کوئی قصّہ نہیں
یہ عجب منطقے ہیں کہ ان پر
کوئی حرف رکھنے لگیں تو سخن ڈولتا ہے
قلم کا قدم راستہ چھوڑتا ہے
مگر کب تلک حرف زنجیر ہوتے

سو آ جا! روایت، درایت کے سنگم پہ آ
دیکھ مجھ کو، میں چپ بھی رہوں تو
تجسُّس مرا بے دھڑک بولتا ہے

میں تیری فصیلوں سے سر پھوڑتے
تیری آواز کے راز کو کھولتے کھولتے
اپنا ثِقلِ سماعت لیے
دار سے دل تلک اپنا بگڑا توازُن لیے
تیرے ذرّوں کے اوزان کے سامنے اپنی خِفّت لیے
آج تک میں تجسُّس کی میزاں پہ تُلتا رہا
اب تجسُّس تجھے تولتا ہے

اے مری جُستجو! میں ترا کُو بہ کُو
روتے روتے جہانوں میں رُل جاؤں گا
میں سرابوں سے سیراب ہوتے ہوئے کس جگہ آ گیا
یہ عجب پیاس ہے جو پرانے جوابوں سے بجھتی نہیں
بحرِ بے چارگی!
میں سوالوں کے ساحل کا موتی نہیں تھا

تجسُّس مجھے رولتا ہے

اے تلاشِ حسیں، حُسنِ پردہ نشیں!
تیرے لفظوں کی تعبیر سے تیرے لہجے کی تفہیم تک
تیری آنکھوں کی تفسیر سے تیرے خوابوں کی تجسیم تک
کچھ بھی کُھلتا نہیں ......
کچھ بھی کُھلتا نہیں ہے مگر تیرا بندِ قبا ہو کہ ہستی کا عُقدہ
تجسُّس گرہ کھولتا ہے
تجسُّس بہت بولتا ہے

سراب

ترے آبِ گُم کی تلاش پر
مری زندگی کی اساس ہے
مرے دل سے تیرے سراب تک
مرا راستہ تری آس ہے
وہ اِرَم عدن کہیں کھو گئے
یہی چوبِ جاں مرے پاس ہے
یہی ریگِ دل مرا جسم ہے
یہی دشتِ درد لباس ہے
اسی دشتِ درد میں دور تک
تری آس ہی، مری پیاس ہے

دُور تک کوئی نہیں

آج پھر پیاس کے بادل سے اُمڈ آئے ہیں
آج پھر آنکھ نے ساون کی دُہائی دی ہے
اتنے بے نور زمانوں کی مسافر دھرتی
چشمِ بے نور بھی کیا دیکھے گی
چار سو دشت! بگولوں سے نکلتے چہرے
حجلۂ جاں میں نظر دور تلک بھٹکے گی
کس کو معلوم ہے کس نقش پہ پتھر ہو گی!

جسم بادل سے بنے آنکھ تلک آئے تھے
ایسے معدوم ہوا روپ کا سونا' جیسے
زاویہ دھیان کا خورشید بدل ڈالے، تو
آنکھ بادل کو سہولت سے بدل دیتی ہے

چشم، پیکر کی تراشندہ ہے؟
جسم پانی سے بنے تھے شاید
دل نے آنکھوں سے بہا ڈالے ہیں!
جسم خوشبو سے بنے، نازک اندام
آنکھ پیکر سے ہٹائے نہ ہٹے
جسم پتھر سے نکل آئے قدامت اوڑھے
چشم پیکر کی تراشندہ ہے!
جنگلوں جنگلوں تجسیم مجسّم ہو کر
کس کی صورت کی طرف چلتی چلی جاتی ہے

آسمانوں کو دریچوں سے سجاتی آنکھو!
دور تک کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں
کوئی روزن کوئی جالی نہیں زندانوں میں
دور تک دھند ہیولوں کے جہاں بکھرے ہیں
کوئی پیکر بھی نہیں
صرف گماں بکھرے ہیں!

کفن چور

کچھ نہیں، گھر میں مرے کچھ بھی نہیں
کوئی کپڑا کہ حرارت کو بدن میں رکھتا
لقمۂ نانِ جویں، خون کو دھکّا دیتا
من کو گرما تا سکوں، تن سے لپٹتا بستر
کُچھ نہیں، کُچھ بھی نہیں، کُچھ بھی نہیں

رات کو جسم سے چپکاتی ہوئی سرد ہوا
جسم کے بند مساموں میں اُترتی ٹھنڈک
سنگِ مرمر سی ہوئیں خون ترستی پوریں
ہاتھ لرزاں تھے، امیدوں نے مگر تھام لیے

پاؤں چلتے ہی رہے شہرِ خموشاں کی طرف

پردۂ خاک میں لپٹے ہوئے بے جان وجود!
باعثِ ننگِ زمیں ہوں، مگر اک بات بتا
جسم مٹی ہو تو کپڑوں کی ضرورت کیا ہے؟
دیکھ پیوندِ زمیں! میرے تنِ عریاں پر
داغِ افلاس کا پیوند... اجازت دے دے
مر کے مرتے ہوئے انسان کو زندہ کر دے
ایک ملبوس کمانے کی اجازت دے دے
ورنہ بھوکی ہے بہت خاک، کہاں دیکھے گی
جسم کھا جائے گی، پوشاک کہاں دیکھے گی!

اساطیر

یقینِ ناحق کے کور چشمو!
یہ کن صحیفوں کی آیتیں ہیں
فلک کی شاہی کے نام پر تم بشر کو اپنا غلام کر لو
یہ کون گزرا ہے
خوف سے زرد لونڈیوں کی قطار لے کر
وہی نہیں جس نے دورِ دیں میں
خیال کی جوئے شیر پانے کو
جنّتِ ارض پر لہو کی لکیر کھینچی
حضورِ افلاک، خونِ آدم کی نذر مانی
خدائے واحد کے نام پر اُس کی خلق تقسیم کر رہا ہے
غرور، مصنوعی رفعتوں کا

لبِ خطابت سے بانٹتا ہے

یقینِ ناحق کے کور چشمو!
یہ کس جبیں پر پیام اترے
نظر بس اک سمت دیکھتی ہو
خیال، طوقِ حدود پہنے
قدم کو زنجیر کھینچتی ہو!
رہینِ اوہام، برتری کے وراثتی افتخار ٹوٹے
تو سارے انسان ایک جیسے تھے!
اب غلاموں کے لحم وخوں کو
بکاؤ ہونے کی ذلتوں سے بچالیا ہے
رواجِ کُہنہ کو یوں مٹایا
جبیں کو بے داغ کرلیا ہے!

تین اور تین سو

عورتیں
رقص کرتی ہوئی عورتیں
رات آنکھوں سے ہو کر گزرتی ہوئی
تیز سازوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے
دم بہ دم، خم بہ خم
محوِ نغمہ سماعت لرزتی ہوئی
گھومتے، جھومتے، زاویے، دائرے، قوس بنتے بدن
رقص کے ایک اک بھاؤ کا
دردِ تخلیق سہتی ہوئی عورتیں!

آدمی
تین جسموں کو تکتے ہوئے

تین سو زر بکف آدمی

ساری آنکھیں اُن آنکھوں میں ہیں
جو فقط زر کے منظر میں ہیں
رقص دو رُخ پہ چلنے لگا
تال بٹنے لگی
کوئی دل کے، کوئی زر کے ٹھیکے پہ تھا
ناچتے، مست ہوتے ہوئے آدمی!

منتظر عورتیں

رات آنکھوں سے ہو کر گزرتی ہوئی
ہجر بستر پہ پہلو بدلتے ہوئے
کربِ تنہائی سہتی ہوئی عورتیں
تین سو عورتیں!

ورکنگ وومن

دو نازک سے کاندھوں پر تم
کِتنا بوجھ اُٹھاتی ہو
گھر کی چھت کا
کمر توڑ مہنگائی، بھاری ٹیکسوں کا
دفتر کی ذمہ داری کا
تیز کسیلی باتوں، میلی نظروں کا
انگ انگ پر چلتی پھرتی آنکھوں کا
گلی میں بیٹھے وزنی فقروں
آنے والی کل کی بوجھل فکروں کا

کتنے بھاری پتھر ہیں!

بیتی یادوں
نئی محبت کے وعدوں کا
گھنی گھنیری زلفوں کا!
دو ننھے سے کاندھوں پر تم اِتنا بوجھ اُٹھاتی ہو
صنفِ نازک کہلاتی ہو!

ٹیڑھی ترازو

پھسلنا نہیں تھا
مگر اُس کے پھسلاؤ میں ایسی پھسلن تھی
کوئی رُکے بھی تو کیسے
وہ ہنستی تو عالم کو مسرور کرتی
وہ چلتی تو وعدوں کے مینار ٹھوکر سے مسمار کرتی
وہ رُکتی تو دنیا کو ٹھہرا کے رُکتی
نگاہوں کے گرداب ایسے
مسافر کو اپنی طرف دور سے کھینچ لیتے!

پھسلنا نہیں تھا

مگر میرے ہونٹوں سے باتیں پھسلنے لگیں
جھوٹی سچّی وہ باتیں جو پھسلاتی ہیں
کیا کہا......؟
تم مرے گھر میں رہتی ہو، میری ہو، میری!
تمہیں حق نہیں ہے کسی اور جانب کو پھسلو
تمہارے لیے صرف میں ہوں
یہ ہرگز نہ بھولو
کہ تم ''تم'' ہو اور میں تو صدیوں سے ''میں'' ہوں!

رب رانجھے ورگا ناں

وہ لڑکی عجب ہے
کسی سے کوئی سوچ لیتی نہیں
اپنے من میں اُتر کر سبھی بھید لیتی ہے
سُنتی نہیں
کہہ رہی تھی خدا سے
تجھے سوچتی کیوں رہوں میں
بتا! آسماں کے کسی بند کمرے میں
سب بتّیاں بند کر کے کبھی تُو نے مجھ کو بھی سوچا؟
نہیں نا......؟؟

اگر سوچتا تو مری ساتویں حِس بتاتی
میں لڑکی ہوں، سب جانتی ہوں
مجھے جب جہاں کوئی دیکھے کہ سوچے

اکیلا وہ جب بند تاریک کمرے میں
پوری لگن سے مجھے سوچتا ہے
تڑپ کر شعاعیں مرے دل تک آتی ہیں
لڑکی ہوں میں
رات دن من کی بتّی بجھا کر اُسے کیوں نہ سوچوں
جو شب بھر مجھے سوچتا ہے
تجھے سوچتی کیوں رہوں میں!

میں نے مجھ سے کہا

(خود فراموش کو آخری بلاوا)

حال کیا پوچھتے ہو مرا
جب یہ ماضی بنے گا تو میں تم سے پوچھوں گا
کیا حال ہے!
کتنی مدت ہوئی
تم نے مجھ کو اُچٹتی نظر سے زیادہ نہ دیکھا
جو اَب سن رہے ہو تو کہہ دوں وہ باتیں
جو کہنے کی حسرت لیے میں ہمیشہ قدم تیز کرتا رہا
پیچھے پیچھے تمہارے، میں بچہ سا چلتا رہا
تم نے مڑ کر نہ پوچھا میں کیا چاہتا تھا
میں آزادیوں کا طلب گار تھا

تم نے زنجیر ڈالی
میں لفظوں کا رسیا تھا، تم نے مجھے
ہندسوں کے اُلجھتے ہوئے جال میں باندھ رکّھا
مرے خواب، بچّے کی حیرت، محبت تھے
اندر کی آواز پر رُخ بدلنا
کہیں جا نکلنا
کسی کی محبت بھری بات کے زاویے کھوجنا
اور دریا کنارے
کتابوں کی گہرائی میں ڈوب کر
اک تحیُّر کے دو گھونٹ بھرنا
مرے خواب تھے، اور تم؟
تم حقیقت میں کھوئے ہوئے بھول بیٹھے
کہ دنیا کے جنگل میں خوابوں کی سمتیں تو کیا
لوگ آنکھیں بھی کھو بیٹھتے ہیں
سُنو! تم جہاں بھاگتے ہو، وہاں کوئی منزل نہیں ہے
یہاں کوئی منزل نہیں ہے!
تمہاری کئی سال کی بے رُخی سے میں کم زور ہوں
اور تم آج بھی تیز رفتار ہو

دیکھو! لحظہ بہ لحظہ تمہارے قدم کی
یونہی دور ہوتی ہوئی چاپ سُنتا رہا
تو میں چپ چاپ مر جاؤں گا
اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی
کہاں کون تم سے جدا ہو گیا
صرف حسرت رہے گی
شب و روز حسرت تمہارے جلو میں چلے گی

حسنِ سوگوار کے لیے

(عدن عدیم* کی طرف سے)

حسینہ، بال سلجھاؤ!
اُلجھتی سانس سے سینے کے اُلجھاؤ نہیں جاتے
ہمارے ساتھ مت آؤ، یہ کچی عمر کے گھاؤ
صدا کے تار سے سلتے نہیں
جاؤ...... تمہیں رستے بلاتے ہیں
نئے رستے کی منزل سے ہمارا ذکر مت کرنا
ہمارا کیا
پرانے زخم لے کر جا رہے تھے
اک عجب سارا ستے میں بل پڑا ہے
ساتویں جانب مسافر چل پڑا ہے
اس طرف آتی صدا بے سود ٹھہرے گی

---

* کوئٹہ کا رعنا نظم گو دوست جو بے ثمر فصلیں کاشت کرتے کرتے مر گیا

پکاروں کی لگامیں کھینچ کر رکھو
سواری رک نہیں سکتی!

بھری آنکھوں سے خالی راہ تکتی سوگواری نے
بہت تاخیر کردی ہے
بگولے بین کرتے ہیں
کوئی دو مٹھیاں مٹی کی، تربت پر نہ ڈالے تو
وہی مٹی وہ اپنے سر میں ڈالے گا!
برستے آنسوؤں سے کب سروں کی خاک دُھلتی ہے
دبی چیخوں سے چلتے پاؤں کا رخ موڑنا ممکن نہیں ہوتا
کہیں جانے کی جلدی ہو
تو پھر نوحہ گری، گریہ گزاری کون سنتا ہے
مسافر چل پڑا ہے
تم صدائیں روک سکتی ہو، سواری رک نہیں سکتی!

سمیٹو بین، بکھرے بال سلجھاؤ
یہ آنسو پونچھ لو
اتنا بھی انساں کا نمک ارزاں نہیں ہوتا

کہ دو اشکوں سے دُھل جائے!

پشیماں سسکیاں، آہیں، دعائیہ لفظ اپنے پاس ہی رکھّو

لرزتے لب نہ لرزیں اب

اِنھی خاموش ہونٹوں سے

کبھی جیتے سمے جو تین لفظوں کی کمائی کر نہیں پایا

تو اب جاتے سمے تم سے مسافر کیا کمائے گا

ہوا میں جھولتے بازو یہ کہتے ہیں

پلٹ جاؤ...... ہمارے ساتھ مت آؤ

ہماری چار شانوں پر سواری چل رہی ہے

اور مسافر رک نہیں سکتا!

ویلنٹائن ڈے

(گل فروش دوشیزہ سے)

زرد پتّے بھی گرائے ہوں گے
کانپتی شام میں لندن کی ہوا نے، لیکن
اس قدر پھول کھلائے ہیں ترے گالوں پر
تیرا گل فام بدن کوئی گلستاں جیسے
پھول ہاتھوں میں کئی پھول، مگر تیرے نہیں
اجنبی ہاتھ، ترے ہاتھ سے خوشبو لے کر
اپنے پیاروں کی بہاروں میں چلے جاتے ہیں
چھوڑ کر ایسا خزاں رنگ تری آنکھوں میں
جس کو پھولوں کے خریدار نہیں دیکھیں گے
تیرے چہرے سے نظر پھول پہ یوں کرتے ہیں
جیسے تُو پھول نہیں!

تیسرے درجے کی دنیا ہو کہ پہلی دنیا

زر کی تلوار وہی

مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے

اِس طرف سرد ہوا سے تیرے

تمتمائے ہوئے گالوں سے مجھے یاد آئی ہے

اُس طرف دیس کی دوشیزۂ مفلس جس کے

گال تنّور کی آتش سے دہک اُٹھتے تھے

جو امیروں کے لئے آگ جلاتی رہتی!

کتنا چاہا ہے کہ میں پھول خریدوں تجھ سے

اور پھر پیار سے تجھ کو ہی تھمادوں، لیکن

آخری پھول کی مہکار ترے ہاتھوں سے

آج کی شام کا بازار مرے ہاتھوں سے

دھوپ کے ساتھ، کہیں اور پھسل جائیں گے

مفلسی ایک طرح وار کیا کرتی ہے!

خودکُش

آج پھر رُخ پہ مری اپنی شباہت لے کر
موت رستے میں چلی آئی ہے
راہ میں خلق کے چہرے تو دکھائی دیں گے
موت کا روپ، جُدا رُخ میں نظر آئے گا
آنکھ پھٹتے ہوئے پیکر پہ ٹھہر جائے گی اور سوچے گی
کیا مری اس سے شناسائی تھی؟

آج بھی خون کی ندّی میں نہایا سورج
آج پھر اس کی شعاعوں میں لہو کاری ہے
رنگ سب ایک ہی کایا میں ڈھلے جاتے ہیں
دشت و دل ایک سے منظر میں چلے جاتے ہیں
کُنجِ لالہ ہو کہ ہو سینۂ ابنائے وطن
ہر جگہ ایک سی گل کاری ہے

آنکھ پر دید بہت بھاری ہے!

رنگ اب پیڑ کے سائے اُترے
سوکھتے حلق، ٹپکتی بوندیں
سُرخ دانوں سی ٹپکتی بوندیں
پیاس کا حقِّ نمک اور بڑھا دیتی ہیں
گل کی پوشاک ہو یا پھول سے تن کی پوشاک
ہر جگہ ایک سی گل کاری ہے

ساتھیو! کوئی تو آواز ملے
پیاس کو حلق میں ٹپکاتے ہوئے ہاتھ رُکیں
ایک آواز مری اپنی شباہت لے کر
جَل کو جلتے ہوئے ہونٹوں سے لگانے والی
مجھ کو بچوں سے ملانے والی
دور کے صحن سے آئے مری اپنی آواز
آنکھ میں صرف اندھیرے ہیں، سماعت کی طرح
دور تک آتی نظر آتی نہیں ہے آواز
دور تک شور کا سنّاٹا ہے

وزیرستان

کہاں سے آگے حدِ عدو ہے
کہاں پہ لشکر کی پہلی صف ہے
کہاں ہدف ہے
کسی پہ کھلتا نہیں ہے کچھ بھی
تمام منظر بدل چکے ہیں
صفوں کی ترتیب جا چکی ہے
نہ میمنہ ہے، نہ میسرہ ہے
نہ قلب کوئی، نہ اب عقب ہے
کہاں پہ لشکر کی پہلی صف ہے؟

فلک پرایا ہی تھا

مگر اب زمیں بھی اپنی نہیں رہی ہے
کسی کو کوئی خبر نہیں ہے
کہ کون سا رخ، رُخِ عدُو ہے
چہار سمتوں سے دشمنی ہے
رَجز وہی ہیں، عَلَم وہی ہیں
ہجومِ نعرہ زناں بھی اک سا
مری پکاروں میں، تیرے نعروں میں اسم اک سے
یہ میں گرا ہوں کہ تو گرا ہے
کسی پہ کھلتا نہیں کدھر ہے
فلک کہاں ہے، زمیں کدھر ہے
یہ بھاگتے اسپ
شہ سواروں کے تند نعروں سے کس قدر دھول اُٹھ رہی ہے
غبار آلود منظروں میں تمام سمتیں بدل گئی ہیں
اُلٹ پلٹ ہو کے میں کدھر ہوں
کہیں غلط ہو کے تُو کدھر ہے
وہ وعدۂ ناوفا کدھر ہے
خدا کدھر ہے!

اندر کی جنگ

زمینِ جسم میں دردوں کی بارودی سُرنگیں ہیں
کبھی گولی کی صورت غم اُترتا ہے جو سینے میں
تو ایسے ذہن کے اندر سے سناٹے گزرتے ہیں
محاذِ جنگ کو جیسے ہزاروں ٹینک جاتے ہوں!
چلی آتی ہیں تنہائی کی فوجیں روندنے دل کو
دھنا دھن گرنے لگتے ہیں
اَلم کے توپخانے سے
اداسی کے کئی چنگھاڑتے گولے
اجڑتے دل کی دھرتی پر
کبھی جنگی جہازوں کی طرح آتے ہیں
ماضی کے حسیں قصّے

دکھوں کے بم، دھماکے کرنے لگتے ہیں
بدن میں پھٹنے لگتے ہیں
اچانک ایک زناٹے سے
مایوسی کا راکٹ آن گرتا ہے
زمینِ یاد جلتی ہے
دھواں آنکھوں تک آتا ہے
امیدوں کی جلی چیخیں نکلتی ہیں
فصیلِ جاں لرزتی ہے
تھکے ہاتھوں میں تھاما ضبط کا پرچم
زمیں پر گرنے لگتا ہے
جوابی کاروائی میں یہی کچھ اپنے بس میں ہے
بس اک یلغار اشکوں کی!

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

یونہی اَدھ کھُلا پاؤں اب چلتے چلتے
ادھورے نگر کی زمیں پر پڑا ہے
تو میں سوچتا ہوں
یہاں آپ آیا کہ لایا گیا ہوں
چلو کچھ بھی ہوگا
مگر اِس گھڑی کا فقط ایک سچ ہے
زمیں اور زماں ہیں
چناروں کی چُپ سے صنوبر کی سرگوشیاں ہیں
تمہارے تنفّس میں
اندر کے جنگل سے آتی ہوئی

تیز، گیلی ہوا ہے
یہ بھیگا ہوا راستہ ہے
اور اِس راستے کو تمہارے قدم جانتے ہیں
مگر میں نہیں جانتا نیچے وادی تلک کتنے خَم ہیں!
تو آؤ، گھنے چیڑھ کی اونچی شاخوں سے اُتری ہوئی
پچھلے سالوں کی سونا سلائیوں پہ مل کر چلیں
دیر تک، دُور تک جنگلوں میں بسر ہوں
پرندوں کے لب سے پرانے فسانے سُنیں
تتلیوں کے پروں سے چُرائے ہوئے رنگ سے
سرخ رنگت میں ڈوبی ہوئی داستانیں سُنیں
اور قریہ بہ قریہ
زمیں کے کٹاؤ سے کٹتے ہوئے لوگ دیکھیں
یہاں اور وہاں
آسمانوں کے ازلی کھنچاؤ سے کھنچتے ہوئے
اِس جگہ سے کہیں ٹوٹ کر اُس جگہ جا کے جڑتے ہوئے
سات رنگوں کے رشتے کی گرہیں گنیں!
جبر اور صبر میں ڈوبتے، تیرتے اور اُبھرتے ہوئے
اپنے اشکوں کو بادل کے پلّو میں باندھیں، سنبھالیں

کسی درد کی تیز بارش میں مل کر نہا لیں!

مجھے یاد رکھنا!
کبھی جب چناروں کے ہاتھوں سے پھسلی ہوئی برف
رستوں پہ گرنے لگے
پاؤں پڑنے لگے
پیر پنجال پر بادلوں کی نظر ہو
چکوٹھی، چناری پہ بوندیں پڑیں
اور جہلم سے نیلم دو آبے پہ ملنے کو آئے
تو پھر یاد کرنا
کوئی دُور کی گندمی سرزمینوں سے آیا
تمہارے پہاڑوں پہ بکھرا ہوا باجرا ڈھونڈتا تھا!
چٹانوں پہ سورج کا سونا جب اُترے
پہاڑی پرندوں کی ڈاریں چلیں
سرد، شفّاف چشموں سے مٹکے اُٹھائے قطاریں چلیں
اور کتابیں اُٹھائے، ٹھٹھرتے ہوئے ننھے مُنّے بدن
منجمد آب پر پاؤں دھرنے لگیں
تو مجھے یاد کرنا

نگاہوں میں گُھلتی تپش
اور دل میں دھڑکتے ہوئے ولولے یاد کرنا
وہ متلاشی آنکھیں کہیں کھوجنا
جو تمہاری زمیں پر کسی ہجر کے نقشِ پا ڈھونڈتی تھیں
مہاجر تھیں لیکن یہاں ہجرتوں کے نشاں ڈھونڈتی تھیں
کٹے کوہساروں میں اُجڑی رفاقت
لُٹی دوستی اور جلائی گئی بستیاں ڈھونڈتی تھیں
شبِ شادمانی کی چادر اُلٹ کر
جو ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ڈھونڈتی تھیں

دستِ شفا

بادل آیا ہے کسی رُوپ کا بہروپ بھرے
پھول لے آئے مچلتی خوشبو
تتلیاں رنگ کا چھڑکاؤ کیے جاتی ہیں
چوٹیاں تن کے کھڑی حُسن بھری دھرتی پر
جیسے سورج نے شفق لا کے دھری دھرتی پر
وادیاں سبز ڈھلانوں میں سمٹ بیٹھی ہیں
ہونٹ چھوتی ہی چلی جاتی ہے بے باک ہَوا
گال خوشبو سے بھرے دیتی ہے نم ناک ہَوا

روپ جیسا بھی بھرے رنگ بدلتا بادل
نُقرئی جسم ترا کیسے بنے
پھول کیسی ہی مہک لے آئیں

ہائے وہ تیرے بدن کی خوشبو
من کے اندر سے کہیں آتی ، دہکتی خوشبو
تتلیاں رنگ چھڑک سکتی ہیں
ہائے وہ رنگِ نظر سوز کہاں
تیرے پیراہنِ خوش رنگ سے جو چھَنتا ہے
چوٹیاں جتنی تنی ہوں، ترے جوبن سی نہیں
وادیاں کچھ بھی سہی ، تیرے نشیبوں سی نہیں
کیا یہ ممکن ہے کہ وہ رنگ شفق میں آئے
جو ترے رُخ پہ ترے تن کی تپش سے آئے
ہونٹ نرمی سے چھوئے ، چھُوتی رہے نرم ہَوا
تیرے گالوں، ترے ہونٹوں سا نہیں لَمس ہُوا!

حُسنِ ماحول اُداسی کو بڑھا دیتا ہے
لاکھ قدرت کے نظارے ہوں مگر تنہائی
آنکھ سے آنکھ ملاتا ہوا منظر مانگے
چاہے نظروں میں گھُلے رنگِ شبابِ فطرت
دیدۂ ہجر تو انسان کا پیکر مانگے

آٹھواں دن

تاریکی تھی
تاریکی بے حرف تھی
جس میں حرف کا نُور کیا
یوں پہلا روز ہوا

حرفوں کے ذرّات کو جوڑا
مٹی سے کچھ لفظ بنائے
لفظوں کے ڈھیلوں کو توڑا

دوسرا روز ہوا

گہراؤ سے دھرتی نکلی
دھرتی سے پھر کھیت نکالے
لفظوں کی کھیتی میں جا کر دل ہموار کیا
اور تیسرا روز ہوا

کھیت میں سطریں سیدھی کر کے
آنکھ کے نم سے سینچ کے
دَم کا اک چھڑکاؤ کیا
یوں چوتھا روز ہوا

سطروں میں معنی کے بوٹے
پھول خیال کے ٹانکے
جن سے دل کو شاد کیا
پھر پانچواں روز ہوا

پھولوں کو چُن چُن کے

اشکوں کی مالا میں ڈالا
گلے میں مالا ڈال کے گریہ صبح و شام کیا
یوں چھٹا روز گزرا

ساتواں دن پڑھنے کا دن تھا
ایک تقدس پڑھتے پڑھتے
فرصت کے اس دن کو فرحت کرتے کرتے
ورق ورق پر اپنے آپ کو تکتے تکتے
سارا دن گزرا......

آٹھواں دن تو تیرا دن تھا
تو نے مجھ کو پڑھنا
پڑھ کر کام مکمل کرنا تھا
آٹھویں دن کا انتظار ہے
آٹھواں دن...... جو تیرا دن ہے!

کیا ملتا ہے

کیا کرتے ہو
آنکھوں سے اوجھل بیٹھ کے تم
کیوں آب تُراب ملاتے ہو
کیوں ہستی کو پگھلاتے ہو
اور دُود و وجود بناتے ہو
اس دہر کے آتش دان میں تم
کیوں اپنی جان جلاتے ہو
شمشیر زیاں کی ضربوں سے
کس زخم کا سود کماتے ہو

بے کار تردّد کرتے ہو
اور جبر پہ صبر سکھاتے ہو

اس گہرے گھُپ ویرانے میں
تم بود نبود سجاتے ہو
پھر سامنے بیٹھ کے آنکھوں کے
تم خاک میں خون ملاتے ہو
کیا ملتا ہے

چُپ کی چادر

جتنے اونچے ہیں اتنے ہی خاموش ہیں
کن پہاڑوں میں رہنا پڑا ہے مجھے
سارے اپنی بڑائی کے دُھن میں مگن
دیکھتے جا رہے ہیں مگر بات کرتے نہیں
بات کرتے ہیں تو خود سے آگے کوئی لفظ کہتے نہیں

اپنے ہی بوجھ سے
میری خاموشی کُوزہ کمر ہو گئی

تو چلی اک بڑی خامشی کی طرف
اور مری ننھی سی خامشی نے کہا
میں بھی خاموش ہوں، تُو بھی خاموش ہے
دھرتی خاموش ہے
یہ خموشی کا گھونگھٹ اُٹھائے تو میں اس کی سانسیں گنوں
اے قدیمی خموشی!
جو تُو اور میں چُپ کی چادر اتاریں
تو دھرتی تکلّم کا ملبوس پہنے
پہاڑوں سے ایسی صدائیں اُٹھیں
جو سمندر کے سینے میں سوراخ کر دیں
یہ کچلی ہوئی خلق اُٹھّے
تو چیخوں سے پاتال ہلنے لگے
موجِ نالہ روانی کرے
اور سینوں میں سہمی صداؤں کی برفوں کو پانی کرے
لفظِ ممنوع پھر سے چلے
سوچ کی سرزمیں پر نئی تخم کاری کرے
خیر وشر کی حدوں پر نئی حد کو جاری کرے
اے بڑی خامشی! اے......

مگر خامشی پہلے سے بڑھ کے خاموش تھی!

دل کے غُرفوں میں سوئی صداؤ!
اُٹھو! صُورِ آدم اُٹھاؤ
سرافیل سویا پڑا ہے
تمھی کوئی شورِ قیامت جگاؤ
اُٹھو بے نواؤ!
تمھی اپنی مٹی کی دھڑکن میں دھڑکن ملاؤ
تمھارے بدن پر ہے تعمیر جن کی
صداؤں کی لرزش سے
اُن اُونچے بُرجوں کو مل کر زمیں بوس کر دو
کسی کو نہیں مانتی ہیں
صدائیں کوئی اُونچا نیچا نہیں جانتی ہیں!

سامراج

کس کے الفاظ رُعونت کے فلک سے اُترے
جیسے تقدیر گزیدوں پہ نوشتے اُترے
کس نے آنکھوں میں پروئی ہیں پرائی درزیں
میرے آنگن میں نگاہوں سے پھرا کرتا ہے
چھپ کے افلاک میں دنیا کو تکا کرتا ہے
فیصلے بھیجتا رہتا ہے زمانے کے لیے
اور ہتھیار نکلتے ہیں منانے کے لیے
میری تہذیب کا ہر نقش بدل دیتا ہے
اپنے نقشے کی لکیروں سے ملانے کے لیے!

گھر کو مانگے کی ضیاؤں سے سجانے والو
عارضی دید کا احسان اٹھانے والو
اُس کے سورج سے جو آنکھوں کو بچا کر دیکھو

روشنی خون کی تصویر نظر آئے گی
تم نے چڑھتے ہوئے سورج سے کیا عہدِ وفا
اُس نے جلتے ہوئے ملبے سے لیا عہدِ وفا
پھر بھی مجروح اناؤں پہ گرے ملبے سے
دھول اُٹھتی ہے تو انکار رقم ہوتا ہے
کس کا سر ہے کہ جو اقرار میں خم ہوتا ہے؟

چشمِ نالاں سے اُمڈتے ہوئے باغی لفظو!
کہہ بھی ڈالو میں مظالم کا طرف دار نہیں
چاک دامن پہ نئے حکم کا دھبا نہ لگا
ہم سے اس حکم کی تعمیل نہیں ہوتی ہے
آدھے منظر کو خموشی سے بھگتنے والو
کوئی تصویر ادھوری جو رہی ہو، اُس کی
دیکھتے جانے سے تکمیل نہیں ہوتی ہے
حرفِ بے باک کو اِمکان میں رکھنے والو
میری آواز کو اِنکار سرا میں رکھنا
زندگی جبر کی زنبیل نہیں ہوتی ہے

پلاسی ۱۷۵۷ء

(نواب سراج الدولہ کے لیے)

کوئی چڑھتا ہوا دریا کنارے روک لیتے ہیں
مگر خود ڈوب جاتے ہیں

سمندر پار کالی دلدلوں سے
سینکڑوں آنکھیں نکل کر دیکھتی تھیں
دوسروں کو، خود کو، اِس دُنیا کو اور مخفی خدا کو
اُس طرف کوئی جنوں تھا جاننے کا
جاننا طاقت میں بدلا
تجربہ چشمِ تحیُّر سے ملا گویا دھماکا ہو گیا!
جب علم کی طاقت حدوں سے بڑھ گئی
تو ظلم کی صورت سمندر میں اُتر آئی

خدا کو جان لینے کا عجب سازعم چل نکلا
بشر کی جان لینے کو مرے ساحل پہ آن اُترا
سمندر پار کی اُن بستیوں سے جھانکتی آنکھیں
زمیں کو ناپتی آنکھیں
مری ہریالیوں کو حرص سے تکتے
مرے سینے تک آ پہنچیں!

مذاہب کندھے سے کندھا ملائے دور تک دیوار تھے
ہر رُخ مجاہد سر بکف اور صف بہ صف
دھرتی کی پوجا کر رہے تھے
سامنے کے وار تو سینے سماتے تھے
مگر وہ تیر جو پیچھے سے آیا
دل کو گھایل کر گیا!
گھوڑے نے اگلے پیر اُٹھائے اور ہوا پر رکھ دیئے
رنگیں عمامہ گر پڑا
پوشاک نے خاشاک پہنی
خاک نے اُٹھ کر دہائی دی
خدایا اس زمیں کی خیر ہو

خاشاک میں لتھڑے ہوئے ان خاکیوں کو دیکھ
جو دھرتی کی ارتھی پر
بِنا دو گز کفن، لپٹے ہوئے ہیں
مر کے بھی غیروں کے
اُن بڑھتے ہوئے پیروں کی ٹھوکر بنتے جاتے ہیں
جو دھرتی روندنے آئے!

ہر اک چڑھتا ہوا دریا کنارے روکتے ہیں
ڈوب جاتے ہیں
مگر وہ نام......زندہ نام
جس کے سارے حرفوں میں
زمانے پھاندتی اک روشنائی ٹمٹماتی ہے
نگاہیں جم کے دیکھیں تو
عجب جلتا ہوا نم آنکھ کو معمور کرتا ہے
اندھیرے نور کرتا ہے

مرگِ ناگہاں کا نوحہ

وہ بے اِختیاری کے دن تھے
زمیں، آسماں، مرگ زارِ تمنّا
مکاں، لامکاں، چارہَ بے دلاں
نفرتیں اور خوں اور خوں کا جنوں
کچھ بھی بس میں نہیں تھا
محبت بھی بس میں نہیں تھی
کہ دِل دسترس میں نہیں تھا
وہ بے اختیاری کے دن تھے
زمان ومکاں اپنی دُھن میں مگن تھے
مجھے اپنی مرضی کی دُھن کی لگن تھی
وہ دھن جو بدن نے کسی ساز پر آزمائی نہیں تھی
سو میں سیپ کی تیرگی میں پڑا
صرف اپنے بدن کی صداقت لئے

اپنی ہستی کی ظلمات پر نوحہ زن تھا
خموشی کی ہر بات پر نوحہ زن تھا
اچانک تری آنکھ روشن ہوئی
میں نے دیکھا تو اُس میں مرا عکس تھا
یعنی میں تھا، مری دست رس تھی
اور اُس دست رس میں ترا عکس تھا
اب محبت مرے بس میں تھی
اور میں خوش تھا
عجب اختیار آ گیا
جب ترا ہاتھ ہاتھوں میں تھا
دو جہاں کی طنابیں مرے ہاتھ میں تھیں!
ترے جسم کے راستوں پر مرے پاؤں پڑنے لگے
تو ستارے مری رہ پہ چلنے لگے
اور میں خوش تھا
تری چھاتیوں کو پکڑ کر زمامِ زمان و مکاں کھینچتا تھا
بہت مطمئن تھا
ذرا ہاتھ آگے بڑھا کر سبھی دوریاں کھینچتا تھا
ترے جسم کے زیر و بم اور ہستی کے سب پیچ و خم ایک تھے

میں ترے گیسوؤں سے بندھا رازِ ہائے جہاں کھولتا تھا
نظامِ زمن مجھ سے منظوم تھا
میں یہاں نظم کی ڈوریاں کھولتا تھا!
میں خوش تھا، بہت مطمئن تھا
مگر آہ! مرگِ تمنّا!!

عجب ناگہاں موت ہے
بے گماں، بے نشاں، بے ارادہ
مجھے بخش دینا مری ہم بدن!
کیا کروں میں؟
سبھی رنگ تیرے وہی ہیں
مجھی میں وہ رنگِ تمنّا نہیں

بے دلی ہے
عجب بے بسی ہے جو بس میں نہیں
میں بقائے تمنّا کی حسرت میں جلتی ہوئی
تیری آنکھوں سے کیسے کہوں گا
دوامِ تمنّا بس اک خواب ہے
اپنے بس میں نہیں، دست رَس میں نہیں!

بدن کی حمایت میں

بہت ہو چکی تن کی نِندا
بہت لوگ کرتے رہے ہیں بدن کی مذمّت
مری گل بدن!
آج تیرے لبوں سے بدن کا قصیدہ جو پھُوٹا
مشیّت کے ٹانکے اُدھڑنے لگے ہیں
ندامت کے پُرزے بکھرنے لگے ہیں
اچنبھا! اچنبھا!
لبِ تشنہ خُو سے
بدن کی حمایت میں بھیگے ہوئے لفظ گرنے لگے ہیں

مری لالہ رُخ!
میں تو کہتا رہا
آنکھ پر بے یقینی کہاں تک چلے گی
تجھے دیکھتا ہوں تو تیرا بدن ہی نظر کو سجاتا ہے

اے سرو قامت!
نظر کے ورق پر ترے انگ کا رنگ ہے
کوئی رنگیں فسانہ نہیں
یہ ترے جسم کا سچّا سچ ہے
تخیّل کی بیمار صنعت سے نکلا خیالی سراپا نہیں ہے
کہ جو سوچنے کو حسیں ہے، چھوؤ تو نہیں ہے
یہی ہے، یہی ہے، حقیقت یہی ہے
کہ جو دیکھتا ہوں میں وہ دیکھتا ہوں!
فلک کی سکونت کسے چاہیے ہے
اِنھی گنبدوں کو ذرا دائیں بائیں کرو
درمیاں کچھ جگہ ہے
یہیں میں سکونت کروں گا!

مہک اے گُلِ خوب رُو!
آ! مری چھاتیوں پر پڑا رہ

مرے تن کے باغوں میں رہ لے
مہک لے، بہک لے
کہاں جائے گا
کچھ نہیں...... کچھ نہیں
آنکھ کی کھیتیوں سے پرے کچھ نہیں ہے
ارے کچھ نہیں ہے!

قلبِ ماہیّت

ریت ہوا سے مل جائے تو صحرا اِک دیوار کی صورت
آنکھ کو اندھا کر دیتا ہے
ریت بگولوں میں گھومے تو دنیا گھومنے لگ جاتی ہے
منظر ریگ پہن کر ایسے چل پڑتا ہے
آنکھیں پاؤں نہیں رکھ پاتیں!
ریت اور سورج مل جائیں تو آنکھ سراب میں کھو جاتی ہے
یہ آنکھوں کی سکھی سہیلی نہیں
کہ اِس کا اِک ذرّہ بھی پڑ جائے تو
چشم کو چشمہ کر دیتا ہے!

ریت کبھی جو آگ سے مل کر

جسم و جاں سے پگھل جاتی ہے
نئے وجود میں ڈھل جاتی ہے
اپنے اندر رستہ دے کر آنکھ کو وہ منظر دیتی ہے
جس کو آنکھ ترس جاتی تھی
سب کچھ دیکھتی رہتی تھی
اور خود کو دیکھ نہیں پاتی تھی!

ہم دونوں بھی جسم و جاں سے پگھل جاتے ہیں
اِک دُوجے کی آنکھ کے ساتھی
آئینے بن جاتے ہیں

بھٹکتی ہوئی انگلیاں

(ایک پچّی کاری)

......تو موڑ کاٹتے ہوئے ندی میں......
حادثے کے زخمیوں......
دکان میں رکھا گیا تھا...... پھٹ گیا
ہلاکتوں میں ......خون کی اپیل ہے

نمک حسبِ ضرورت ہو
پکائیں ...... چھ منٹ کے بعد......
موتی چھوٹے چھوٹے ہیں
کڑھائی میں ......نیا فیشن......
نئے البم میں گیتوں کو...... نئے انداز میں
یہ سب معاشرتی برائیاں ہیں

دعا ہے دین کو سمجھیں......

جہازوں نے مسلسل آٹھ گھنٹوں تک......

گھروں میں آگ لگنے سے......

کئی بچوں کو اغوا کرلیا......

گردے چُرانے میں مسیحا بھی......

ملوث لوگ......

اک لیموں کے رَس......چہرے کو دھولیں

چار گھنٹے ہی میں بس رنگت نکھر آئے

ہڑپا کے......

بڑی ترتیب سے گلیاں

مکانوں کو......الگ گودام......

لمبی سانسیں لیں......گردن

کمر کی سیدھ میں لائیں......

بڑا ریلا......مکاں خالی کرائے جا......

وطن کی سیاسی فضا میں......وڈیرے

کرپشن......تسلسل......

میں ایکٹنگ کے شعبے میں اک جوش سے

یہ ارادہ ......خدا کے کرم سے ......

خریدیں ......زیادہ منٹ بات ......

بہتر کنکشن کہاں ......

بال سِلکی ...... چمکتے ہوئے دانت

گورا کرے ......

اتنی آسان قسطیں کہاں ......

عکس وآواز کا ایک جنگل ہے
جس میں مسلسل بھٹکتی رہیں

چار بٹنوں پہ دو انگلیاں
آنکھ ٹکتی نہیں
دل ٹھہرتا نہیں
وقت رُکتا نہیں

لوحِ جہاں نُما

کمرے کے ہر اِک کونے میں
اندر کا ویرانہ تھا
باہر رات کے پھیلاؤ میں باہر کا ویرانہ تھا
دیواریں نظروں سے گِرا کر
ویرانے سے ویرانے کی حدیں مِلائیں
اتنا کامل خالی پن تھا
کچھ بھی نہیں تھا
میں بھی نہیں تھا!

روشنیوں سے رنگ اُڑاتی
ایک طلسمی کانچ کی کھڑکی
تنہائی کے خالی پن سے

ست رنگی دنیا کی جانب کھُل جاتی ہے
اِس جادوئی دنیا اندر سب دِکھتا ہے
سب ملتا ہے، سب بکتا ہے
اک روشن کھڑکی کی آنکھ سے
کتنے منظر برس رہے ہیں
صحراؤں پر بادلوں جیسے
جھوٹے سچّے منظر دیر تلک برسے ہیں
لیکن ریت کی پیاس وہی ہے!

میں اِس جادونگری کے بازار میں خود کو ڈھونڈ رہا تھا
ایک دکان پہ اپنی ایک نشانی سے خود کو پہچانا
قیمت پوچھی
بھاؤ تاؤ کر کے جلدی اپنا آپ خرید لیا
اب مہنگے داموں بیچوں گا!

کس گھاٹ لگوں

کس ساگر میں اُتر پڑا ہوں
ہر رستے پر کتنی لہریں آگے پیچھے نکل رہی ہیں
جھاگ اُڑاتی، ظلم کماتی
اپنے من کی موج میں بہتی
لہریں، لہریں نگل رہی ہیں
پیچ وتاب کی لہروں پر میں بل کھاتا لہراتا جاؤں
بے مرضی، بے قابو، بے دم بہتا جاؤں
بے بس ہاتھ بدن سے باہر
کس گرداب نے تھام لیے ہیں

گھوم رہا ہوں

دو پاٹوں میں پِسنے والو مجھ کو دیکھو
سینکڑوں پاٹوں میں پِستا ہوں
دور کنارے آنکھیں بھیج کے سارے منظر دیکھ رہا ہوں
ریت، کھجوریں، اونٹ، چٹائی
فوکس سے باہر لگتے ہیں
فولادی عفریت کی صورت
صاف دکھائی دینے والی موت سمندر میں پھرتی ہے
رنگ برنگی چھتری نیچے
رنگوں کی دھجیوں سے اپنے عضو چھپائے
تن کی لہر پہ مست ہُلارے لینے والے لوگ بہت ہیں
اُلٹے سیدھے پڑے ہوئے ہیں!
دُور کھڑے ننھے چہروں پر چُبھنے والی ریت اُڑتی ہے
میلی اور مٹیالی آنکھیں
حیرت حسرت گود میں لے کر
گورے چہرے دیکھ رہی ہیں

رنگ رنگ کے گھاٹ کھُلے ہیں

آسمان بے رنگ پڑا ہے
بند پڑا ہے
آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں
بے بس بازو ٹوٹ رہے ہیں
اور بھنور بے باک ہُوا
بادبان کے ساتھ گریباں چاک ہوا
کس اوٹ سِیوں
میں کھارا پانی آنکھوں کا ۔کس اوک پیِوں
ہچکولے کھاتا جسم لیے کس گھاٹ لگوں؟

ان کہی لفظ مانگتی ہے

مرے غم گسارو!
مرا درد ایسا نہیں ہے
کہ جو میرے کہنے میں آ جائے
اب تک فلک سے کوئی لفظ اُترا نہیں جو کہے
آؤ دیکھو، یہ ہے ذائقہ درد کا!
رنج کہنے کی سب کوششیں
چرخ چھونے کی خواہش ہیں
بے کار، ممکن سے باہر، زیاں ہی زیاں

اور پھر بھی زباں لفظ کا ذائقہ مانگتی ہے!

مرے چارہ سازو!
مری سانس چلتی نہیں، آگ جلتی ہے
اشکوں کی تیزابیت سے بدن راکھ کا ڈھیر ہے
پھر بھی شعلوں پہ ہے
کربِ موجودگی، دل میں موجود ہے
اور ہونے کی توجیہہ باقی نہیں
آسماں سے بندھا تن زمیں پر گھسٹتا ہے
تو میری ہستی پہ ہستی بھی ہنستی ہے
مرضی سے ہونے کو چلتا ہوں لیکن
زمین و زماں روک دیتے ہیں
ایسے تعیّن نے گھیرا ہوا ہے
بدن کی زرہ راستے بند کرتی ہے
کیسے کروں
جب جہاں ہونا چاہوں تو ہو جاؤں
ہونے سے اُکتاؤں تو چل پڑوں
بے بدن، بے جہت، بے تعیّن

نہ ہونے پہ ہونے کو قربان کر دوں
مگر ایسا ہوتا نہیں ہے!

نہ میں کہہ سکوں گا
نہ تم سُن سکو گے
مرے غم گسارو
میں ہونے کا دکھ درد کیسے کہوں
لفظ خوابوں کے قامت سے کم ہو گئے!
اسم جسموں سے پہلے عدم ہو گئے!

دائرہ صفر ہے

صفر سے چل کے یہاں آئے ہیں
اس سے آگے یہ سفر
صرف گمانوں کی طرف جائے گا
ریگ زاروں سے اُلجھتی آنکھیں
کوہ ساروں سے جھلکتے منظر
بادبانوں سے اُمڈتی آنکھیں
آسمانوں کو پلٹتے رستے
جب ستاروں سے پرے جائیں گے

رائگانی کی سند پائیں گے

جستجو صفر میں بدلے گی ستاروں کی شباہت لے کر
قافلے کون سے صحرا میں دُہائی دیں گے
ریت کس سمت سے آئے گی ضیافت لے کر
کن پہاڑوں کی طرف خوانِ طلب اُترے گا
کون سی موج کی منزل ساحل؟

صفر سے صفر تلک آئے ہیں
اک سفر اور مرے یار! یہاں سے آگے
کوئی رستہ ہے نہ دیوار، جہاں سے آگے
دائرہ صفر ہے اور اس کے پیچھے
موج در موج اُمڈتا جنگل!

کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں
کون کہانی لکھّے
دل کے موّاج سمندر میں کوئی اُترا ہے؟
غم کے صحرا میں کہاں، کس کے نقوش پا ہیں؟

کوہساروں سے پرے، کُونج
قطاروں سے الگ
کس کی جھیلوں کی طرف جائے گی؟
راستہ کوئی نہیں اور ہزاروں رستے
صفر سے چل کے یہاں آئے تھے
یہ سفر 'ایک' کہاں پر ہوگا؟
راستے کتنی طرف جاتے ہیں؟

میٹھا جھوٹ

نجانے کیوں
تری آنکھوں میں چاہت کی وہ شدّت ڈھونڈتا ہوں
جو گئے وقتوں دھنک بن کر دہکتی تھی
یہ وہ رنگوں بھرے دن تھے
کہ ہم اِک دوسرے سے خوب واقف تھے
مگر انجان جسموں نے
تعارف کے مراحل پر قدم رکھا نہیں تھا!

تصنع چھپ نہیں پاتا
محبت خود ہی آتی ہے، اسے لایا نہیں جاتا
ملن کے پل
تری سر توڑ کاوش بھی مجھے تسلیم

لیکن پیار کی اُڑتی ہوئی رنگت کو
کوشش سے چھپانا اب ترے بس میں نہیں
آنکھیں تو دیکھ اپنی
یہ جتنا والہانہ پن دکھاتی ہیں
دکھاوا اور دِکھتا ہے!
تو شاید سچ ہی کہتا ہے
کوئی ایسے جو کہتا ہے
محبت کچھ نہیں ہوتی
بدن ہوتا ہے اور اس کے بہت سارے تقاضے بھی
جو اپنی موج میں آ کر حسیں بہروپ بھرتے ہیں
ہماری تشنگی ان کو محبت نام دیتی ہے
ضرورت سب کو ہوتی ہے
کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے کی
کسی کی آنکھ سے تعریف کے دو بول پانے کی
کسی کے ساتھ چلنے کی، کسی کو رہ دکھانے کی
کہ تنہا کٹ نہیں پاتیں کٹھن راہیں زمانے کی!

ضرورت روپ بھرتی ہے محبت کا

یہ کھیل اس درجہ شاطر ہے
کھلاڑی کھیلتا ہے اور نہیں یہ جانتا
اُس سے ضرورت کھیل کرتی ہے!
سو اب کوشش نہیں کرنا
مٹے رنگوں کو گہرانے
محبت کھینچ کر لانے، دکھانے کی
مری آنکھیں دکھاوا دیکھ لیتی ہیں!

حُسنِ ناراض کو مشورہ

محبت لَوٹ سکتی ہے
اگر ہم ایک دوجے کو اُنھی معصوم نظروں سے پکاریں
جن سے پہلی بار دیکھا تھا
اگر مِل بیٹھ کر دونوں
غلط فہمی کی کالی رات سے باہر نکل آئیں
تو گویا دن نکل آئے!
ہم اب بھی خوبصورت ہیں
ہمارے زرد چہروں
دُکھ بھری آنکھوں میں اب بھی حُسن بستا ہے
جو ہم رخصت کریں اِن تلخ باتوں کو

تو وہ شیریں بیانی خود بخود آئے گی
جو پہلے پہل دونوں کے لہجوں میں
محبت بن کے آئی تھی

اِدھر دیکھو! یہ رستہ اب بھی پیارا ہے
نئے وعدوں کی انگلی تھام کر پھر چل پڑیں
چلتے چلے جائیں
محبت راستہ ہے
اس میں پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں کے قافلے
اب تک ہمارے منتظر ہیں
اب بھُلا ڈالو گلے مل کر گِلے
شکوؤں سے دامن جھاڑ لو
پہلے قدم پر ہی محبت لَوٹ آئے گی!

شبِ مے کشی کی سحر

تجسُّس کو ہم راہ کر کے
تری آنکھ کے اونچے نیچے علاقے میں آیا ہوں
نِکلا ہوں تیری نظر رہ نُما کر کے میں دور تک
میں نے حیرت کو دیکھا
تعجُّب بھرے لفظ ہونٹوں پہ رکھّے
کئی منزلیں چڑھ گیا
نیچے اُترا، اُترتا گیا
سیڑھیاں ہر قدم کچھ نئے منظروں پر کھُلیں
وجد آور وجور اپنے جادو دکھاتا رہا
زیر خانے سے میں بالا خانے تلک
آتا جاتا رہا

آتی جاتی ہوئی جیسے ہر سانس تازہ ہے
کچھ تو نیا ہو، اچنبھا ہو

معمول کا بوجھ اب جسم و دل پر گراں ہے
دھواں ہے، یہ کیا خالی پن ہے؟
ارے ایک دم ایسے خالی نہ ہو جا
شبِ مے کشی کی سحر کی طرح
دِل کَشی سے پرے
ایک خالی مکاں پر اُداسی کی زردی کے چھینٹے
حزیں تشنہ کامی کی قاشیں لبوں پر
اُجڑتی ہوئی بے بصر بستیوں کا غبار آنکھ میں!

آنکھ میں گھل رہے خواب رنگوں کی دنیا ہی رہنا
بھری، اَن دِکھی ، دیکھتی اور آگے کو چلتی ہوئی
تجھ کو دیکھوں تو سپنا بھی دیکھوں
لگاتار چلنے دے اور آگے بڑھنے دے
سوچوں کے پردے اُترنے دے
اب دھیرے دھیرے مجھے کھول
آہستہ آہستہ خود مجھ پہ کھُل!
جب تلک اِک تجسّس رہے گا
تعلّق رہے گا!

محوِ آئینہ داری

یہ سراب مجھ پہ کُھلا نہیں
کسی روز مجھ کو بتا ہی دو کہ کہاں ہو تم
سرِ ریگ ہو کہ نظر میں ہو
مرے پاس ہو کہ مری نگاہ کی پیاس ہو
کسی روز خود سے نکل پڑو
مجھے دیکھ لو
کبھی میں نے جرأتِ شوق سے
اِسی بامِ حُسن تک اِک نظر
بڑی دِقّتوں سے اُٹھائی تھی

اور تم نے آنکھ کو ڈھا دِیا!

خدو خالِ حُسنِ گریز پا، یہ خبر رہے
کہ جو رُوپ تم کو عزیز ہے
اِسے دیکھنے سے دوام ہے
جو بدن پہ پھولوں کے رنگ ہیں
یہ نظر کے باغ سے آئے ہیں
سو گواہِ حُسن کی عرض ہے
رہو محو اپنے جمال میں
مگر آئینے کو بھُلا نہ دو!

اے چشمِ درد آشنا

اک بُوند برس
اک اشک چھلک
خاموش نظر! کوئی بات ہی کر
دل دُکھتا ہے
تُو میرے دل پر ہاتھ تو رکھ
میں تیرے ہاتھ پہ دل رکھ دُوں
دل درد بھرا
جو اِس کو چھوئے
یہ اُس سے مِلے
اک لفظِ محبت بول ذرا

میں سارے لفظ تجھے دے دوں
دل دردِ سراب کو آب سے بھر
تو میرے خواب پہ آنکھ تو دھر
میں تیری آنکھ میں خواب بھروں
خاموش محبت ! بات تو کر
دل دُکھتا ہے

گیت

بابل رے توری بنتی کروں ہوں، کان لگا کر سُن
دل کی بات بہت مدّھم ہے، دھیان لگا کر سُن

آنکھیں جس کی چاہ کریں بس مجھے وہ چھونے پائے
میں جس ہاتھ کو جانوں ناہیں، کبھی نہ مجھ تک آئے

موہ پریت کا بھوجن مورا ، اور کوئی نہ کھائے
تھالی اس کے آگے رکھّوں جو مورے من بھائے

بابل تجھ سے پھول نہ مانگوں، پھول کی باس اُڑ جائے
پیارے پی کا پیار دلا دے کبھی نہ جو کُمہلائے

بابل تجھ سے دھیج نہ مانگوں، مانگوں ایک نیائے
من بھاون مورا گھونگھٹ کھولے، من بھاون لے جائے

میّا جگ بیوپاری ہے

کون ہے جو بازار کو جائے لینے اُجڑے خواب
کون خریدے خالی آنکھیں ، کون خرید ے خواب

کون ہے جو گھاٹے کا سودا سر میں لے کر آئے
کون بپاری ہٹّی سے نقصان کی گانٹھ اُٹھائے

کوئی نہیں جو سب کچھ دے کر، بس مانگے اک جھانک
خالی کر کے دل کا کیسہ 'بھر لے اپنی آنکھ

کون یہاں اک دید کی خاطر دشت اُڑائے خاک
آپ جلائے ہڈیاں اور آپ سمیٹے راکھ

کون نکالے راکھ سے شعلے، کون آنکھیں پگھلائے
کون چُکائے دام غزل کے ، درد کو گھر لے آئے

کون سنے گا سخن سنہرا، سب متوالے زر کے
کس کا دل صہبا کی صورت جام کے اندر دھڑکے *

کوئی تو ہو جو رات کی رُت کو دن کا دان کرے
من میں نم کی جوت جگائے، من پر مان کرے

سپنوں کی سوکھی جھیلوں سے کون کشیدے آب
آنکھ کے جلتے آئینوں کو کون کرے سیراب

چھن چھن کرتے گھنگھرو کی تو سب سنتے ہیں بات
دل کی تال نہ سمجھے کوئی' ناچوں جس کے ساتھ

آپ سمیٹوں پگ پگ چھالے' آپ سنبھالوں نیر
کون چُنے میرے بِرہا کانٹے، کون سہے مری پیڑ *

---

* دانستہ

خالد احمد کے لیے

اے کوکبِ سخن گری، اے کہکشانِ حرف
اُترا ہے ارضِ دل پہ تری آسمانِ حرف

تُو تھا زیاں پسند، زیاں مند ہی رہا
تُو نے جہانِ حرص میں کھولی دُکانِ حرف

اوج و کمالِ ذات کو دیکھا درونِ لفظ
نام و نشان بھول کے پایا نشانِ حرف

معنی نقاب کھول کے ملنے کو آئے ہیں
تُو راز دارِ لفظ ہے، تُو راز دانِ حرف

تُو نے ہر ایک گام پہ بدلے ہیں زاویے
تو نے عجیب ڈھنگ سے دیکھا جہانِ حرف

میں ایک دل خراش ہوں، تُو ایک گل تراش
میں خار زارِ حرف ہوں تو گلستانِ حرف

نسبت تو کچھ نہیں ہے مگر پیش کر دیا
ذرّے نے آفتاب کو اِک ارمغانِ حرف

نیّر اَلَم نصیب ہیں سارے قلم نصیب
وابستگانِ رنج ہیں وابستگانِ حرف

اسلم سراج الدین کے لیے

دیکھا تجھے تو خامشی نے ٹوٹ کر کہا
اس چُپ کدے میں بولنے والا کوئی تو ہے

تاریخ کی کٹائی میں لفظوں کے ڈھیر کو
آدم کے بھاؤ تولنے والا کوئی تو ہے

اوراق پر بنامِ خدا بہتے خون میں
مٹی کی سوچ گھولنے والا کوئی تو ہے

لگتا ہے کُھل ہی جائیں گے ''فردا''* کو راستے
ماضی کی راہ کھولنے والا کوئی تو ہے

آنسو ہوں، مرثیے ہوں کہ موتی حروف کے
رونے ، رُلانے ، رولنے والا کوئی تو ہے

''سامر سمر''* سنائے گا کاغذ کی اوٹ سے
لفظوں میں چھپ کے بولنے والا کوئی تو ہے

---

*''فردا''، جریدہ جو اسلم سراج الدین اور اختر حسین جعفری نے مل کر شائع کیا
*''سمر سامر''، اسلم سراج الدین کا پہلا افسانوی مجموعہ

تم اُداسی کو دیکھ سکتے ہو

اُداسی صبح کی پہلی کرن کو کاٹتی ہے
روشنی میں چھپ کے آتی ہے
اُداسی آنکھ میں گھُلتی ، رگوں میں پھیلتی
دل سے لپٹتی ہے
اُداسی پُتلیوں میں رقص کرتی ہے

اُداسی سِسکیوں سے لفظ لے کر
حسرتوں سے آنکھ لیتی ہے
مجسّم بے دلی سے جسم پا کر ہجر کی تجسیم کرتی ہے

اُداسی وقت کی دُھنکی ہوئی روئی سے
اپنا پیرہن بُنتی ہے، رنگوں پر اُترتی ہے
یہ دن کی بھیڑ میں اوجھل نہیں ہوتی
خوشی اور غم کے بیچوں بیچ چلتی
دُور سے پہچانی جاتی ہے

اُداسی دوپہر کی دھوپ کی قاشیں نگلتی ہے
سُلگتے اشک میں گھُل کر
نظر کے سامنے نَم دار پردہ تان دیتی ہے
گھنی دلدل کی صورت اپنے اندر کھینچ لیتی
ہر بُنِ مُو سے چپکتی ہے

اُداسی شام اوڑھے خامشی کے گھر اُترتی ہے
تھکی آنکھوں سے دیواروں کو تکتی
ہجر کے آنگن میں چلتی
درد کی تانیں پکڑتی
راگ کے دل میں دھڑکتی ہے
بدن کے تار کی لرزِش میں ڈھل کر

بیدِ مجنوں سی لرزتی ہے

اُداسی رات کے کاجل سے دو آنکھیں بناتی ہے
برسنے کو تڑپتی، تِلمِلاتی ہے
اُداسی جاگتی ہے، سوچتی ہے، سو نہیں سکتی
سحر شب آنکھ میں رہتی ہے پھر بھی رو نہیں سکتی
اُداسی کاٹتی ہے، کٹ نہیں پاتی
دلوں میں بانٹتی ہے خود کو لیکن بٹ نہیں پاتی

وصال

دل کی غربال سے چھن چھن کے نکلتی آواز
اتنی صدیوں کی چٹانوں سے گزر کر آئی
لفظ کے بوجھ سے بچ کر نکلی!
بے بدن چلتے ہوئے، عشق کی تجرید صدا
روح کے گیت اجالوں میں سفر کرتی ہے
جیسے موہوم، تصوّر میں بسی وادی سے
بے صدا گونج سماعت میں اُتر آتی ہے
جیسے تجرید سے تجرید ملن کرتی ہے!

مجھ کو آواز کے بے جسم تقدّس کی قسم

بے کراں روح کے نادیدہ اُجالوں کی قسم
وادیِ شوق میں اڑتا ہوا دل کا پنچھی
بارہا تیری بدن شاخ سے ہٹ کر اُترا
آنکھ سے اڑ کے ترے وصل کی بے کل کونجیں
بارہا جسم کی جھیلوں سے الگ اتری ہیں
میری آواز ترے حسن کو جاتے جاتے
تیری بے شکل شباہت کے قریں بیٹھی ہے

میرے محبوب ! بدن چھوڑ کے آمِل مجھ سے

وہی آخری موت تھی

اور اب سوچتا ہوں
مشقت اُٹھا کر
میں کیوں بوڑھے ہاتھوں سے ملبہ ہٹاؤں
کہاں مجھ کو زندہ ملے گا
کئی سال پہلے
جو سنگِ معیشت تلے دب گیا تھا

بہت یاد آتا ہے
مسمار ہونے کا لمحہ
جہاں اپنے ملبے پہ بیٹھے ہوئے
میں بہت دیر روتا رہا تھا
وہ جب میرے ریزوں کو دیکھے بنا
اپنے نقشے پہ آنکھیں دھرے

مجھ کو تعمیر کرتے چلے جا رہے تھے
اُنھیں یہ خبر ہی نہیں تھی
کہ وہ جو بناتے رہے
اُس میں ، مَیں تو نہیں تھا
کوئی اور تھا
فائلیں جس کی آنکھوں میں
اور حکم کانوں میں ڈالے گئے
جس کے ہونٹوں پہ اوروں کے الفاظ تھے!

سال چلتے رہے
دبنے والے کی آواز سننے کو
میں ناخنوں سے یہ سینہ کھُرچتا رہا
اتنی گہرائی میں تھا
ہوا ہی نہیں تھی کہ کچھ بولتا
سوچتا ہوں
کئی سال پہلے جو اِک موت اندر ہوئی تھی
وہی آخری تھی!

کوئی پہاڑ ہٹ گیا

عجیب ٹوٹ پھوٹ تھی کہ کائنات ہل گئی
زمین وہ نہیں رہی
فلک سروں سے ہٹ گئے
قدیم دکھ جدا ہوئے!
ذرا سا ایک زاویہ بدل گیا
کہانیاں بدل گئیں
کہانیوں کے ساتھ خوش گمانیاں بدل گئیں
جمے جمائے ضابطے مدار سے نکل گئے
زمین و آفتاب اپنے راستے بدل گئے
گمان کی چٹان سے جو خوف تھا......نکل گیا
چٹان ٹوٹ کر گری
زمین کے ساتھ مل گئی

عجیب ٹوٹ پھوٹ تھی کہ کائنات ہل گئی!

عجیب تھی وہ روشنی
کہ آنکھ سے نکل کے ہر دیار جگمگا گئی
سمندروں کو ناپ کر
جو ساحلوں کی ریت پر اُتر گئی
تو جنگلوں کو راستے نکل پڑے!
درخت کی جڑوں سے ہو کے
پھول تک جو آ گئی...... عجیب تھی وہ روشنی!

عجیب تھیں وہ بارشیں
برس پڑیں جو ایک بار...... شش جہات دھو گئیں
نئے ہی رُخ نظر پڑے
نکھر گیا ہر آئنہ...... کہ چشم و لب بدل گئے؟!

عجیب سی وہ آگ تھی
گُنہ ثواب جل گئے
سزائیں یا جزائیں جو بھی تھیں وہ سب جُھلَس گئیں

تپش سے خیر و شر کا سارا زائچہ پگھل گیا
جدید خد و خال میں ہر ایک نقش ڈھل گیا
کمال تھا وہ رنگ جو ہر ایک شے پہ پھر گیا
نیا تھا اک جہان میرے سامنے پڑا ہوا!
عجیب سی وہ آگ تھی
وہ آگ تھی کہ آگہی......
کہیں پہ جو رُکی نہیں
جو آگے آگے چل پڑی تو راستہ نکل پڑا
خدا کو پیچھے چھوڑ کر
میں خود کو لے کر چل پڑا!!

”اے دائرۂ السحر میں نو آمد عزیز!
اگر تو ناخوشی سے مملو ایک متبرک سچی بے چینی
اور موجود سے عدم مطابقت تمہارے خون میں موج زن ہے
تو اس دائرے میں رہو ورنہ نکل جاؤ......“

اسلم سراج الدین: پھر کیسی بدلی دنیا (مائیکل اور مکتوم)

نوحہ گر

(طویل نظم)

ضُعف تسلیم مگر جرمِ اسیرانِ جفا!
کوئی چارہ تو کرو، شور دُہائی ہی سہی

نوحہ گر

نہ ہونے کی بے جسم آغوش میں
بے زمانی کے پہلو بچھے خالی پن میں
جہاں بے جہت لامکاں پر
کوئی لاشئ راج کرتی تھی
کُچھ بھی نہ تھا
روشنی ، تیرگی ، سمت آواز ...... سب نیستی !
بے وجودی کے معدوم سے
''کچھ نہیں'' کی عدم دوش چوٹی سے
بس ایک لمحے کا پھسلاؤ
سمت آشنا غیر مادے سے ٹکراؤ
نقطے کا پھیلاؤ ''ہونے'' میں بدلا
تو کچھ وقت تھا...... کچھ جگہ

اور ابد کے اُدھڑنے تلک دونوں پیوست تھے
چند جہتیں گرفتار تھیں
اَن گنت
کم وجودی کے پیکر میں ہنستے ہوئے دیکھتی تھیں
غبارے کی نشوونما
پھیلتا، ٹوٹتا اور بنتا ہوا
رنگ، شکلیں بدلتا ہوا
ہر نئے پل، نئے کا نیا!

میں وہیں تھا
جہاں بے پکڑ سے قلم جب ہلا
تو وہ تختی کسی تخت پر تھی
جو اک حرف کی ضرب پڑتے ہی تختہ ہوئی
دیکھتا تھا میں
اپنے کنارے سے چمٹا ہوا
لاوجودی چٹانوں کے پھیلے ہوئے کالے پن میں
زمان ومکاں سے لتھڑتے ہوئے
آسماں، کہکشائیں، زمینیں
توانائی، مادے کی تجسیم میں

آنکھ پردے تک آتی ہوئی
گھومتی، جھومتی، گرم ٹکڑوں میں بٹتی ہوئی
دیکھتا تھا...... نہ ہونے سے ہونا
خلا سے فضا
''کچھ نہیں'' سے ''بہت کچھ'' اچھلتے ہوئے
اِک دھوئیں سے فلک کو نکلتے ہوئے!

''میں قدیمی ہوں...... مجھ سے سُنو''
قُلّہ کوہ کے سنگ بستہ بدن کے قریں
بے پروں کی صدا پھڑ پھڑائی
تصادُم سے ٹکڑے ہوئی
اونچی نیچی ڈھلانوں، گری گھاٹیوں
سنگ رستوں کے ننگے بدن پر
پھسلتی، لڑھکتی ہوئی سات جانب چلی
''میری آنکھوں میں دیکھو!
وہ گولہ یہیں گھومتا تھا جسے
اپنے شعلہ فشانی گھماؤ کی آتش زنی کی خبر بھی نہیں تھی
یہیں آتشیں ذرّہ باری ہوئی
حادثاتی جدائی کا غصّہ تپِ جاودانی میں بدلا

تو سوزِ نہانی کمائی ہوئی
آگ پانی میں پہلی جدائی ہوئی''

لوگ سہمے ہوئے
بے جہت کی صدا ڈھونڈتے تھے
جو ہر سمت تھی...... اور بے سمت تھی
''میری آنکھوں کی سیّال، بے تاب
گولائیوں ہی میں وہ شام تھی
سلوٹیں جب تو ازُن بنیں
کھال کھینچ کر سنبھالا ہوئی
سالموں نے وہاں
ایک غصّہ بھری برق آواز سے
ہچکچاہٹ بھرا اوّلیں وصل پیدا کیا
پہلا آنسو بنا!
مفردوں کا تنوّع مرکّب ہوا اور ہوتا رہا
آگ داسی تھی ترکیب میں کام آتی رہی
سرد ہونے لگی تو ٹھٹھرنے لگے
سب زمین و زمان و مکین و مکاں
آب آتش، ہوا، خاک جمنے لگے

برف پُتلے بنے
اشک کنکر تھے، چبھنے لگے
لوگ پتھر ہوئے
سرد آہوں میں بہتے رہے اور سنتے رہے
سوزِ خفتہ نے انگڑائی لی
اور غضب کی حرارت سے دیکھا
سبھی تند سیلاب میں بھاگ نکلے
رُکے...... خوف سے جم گئے
پھر پگھلنے لگے
اب جو پگھلے تو آتش کا غصّہ بھی کچھ سرد تھا
رُک گئے
اُس نشیبی ترائی کے مسکن کو دیکھا
جہاں سبز سیّال میں تیرتے تھے زمان و مکاں!
میری آنکھیں سمندر ہیں، اِن سے سنو
نامیاتی لزوجت بھرے ایک محلول میں
چند ذرّوں کی یک جائی نے
کیسے ذوقِ فنا میں بقا ڈھونڈ لی
سبز، گاڑھے سمندر کے نمکیں کنارے
تجسُّس ہوا کو چکھا

نامیاتی ازل سے ابد کی طرف جل تھلی رینگتے تھے
اگر کوئی لمحہ ڈراتا تو پھر بہہ نکلتے
قدیم آب مسکن کی جانب
جہاں کی ہر اک لہر ماں تھی...... اماں تھی!
نجانے ہوا میں، زمیں کی گھنی خاک خشکی میں
کیسی کشش تھی کہ بڑھنے لگے
ساحلوں سے پرے ہو کے قامت نکالے
اور اتنے کشیدہ
درختوں پہ جُھک کر بدن پالتے تھے
وہ ارضی شہنشاہ لاکھوں برس حکم راں تھے
اور اب ایسے نابود ہیں
سطحِ ارضی کی چھوٹی سی پٹی میں بندھ کر
یہیں سنگیائے پڑے ہیں!

پھر اک بار چھوٹوں نے دھرتی بسائی
اور اُن میں سے دو چار نے
اگلے پیروں کو ہاتھوں میں بدلا
لرزتے ہوئے ایستادہ ہوئے
اور کہنے لگے "ہم کو مٹی نے پیدا کیا"

ایستادہ ہوئے تو فلک پر نگاہیں گئیں
یہ تخیل کا آغاز تھا!
گُنڈ مسکن کیے، آگ چکّھی
درُونی تپش سے الاؤ جلائے

جہاں جانور نرم ہوتے رہے
پھر بھی اندر کوئی بھوک تھی
اور آنکھوں کے آگے سے ہٹتی نہ تھی!
اپنے زورِ توّہم سے افلاک آباد کرتے رہے
بے یقینی کے پہروں میں
فطرت کی بڑھتی ہوئی دشمنی کے جوانب میں بکھرے ہوئے
خوف کے آب و گِل سے خدا کو بنایا

یہاں سے وہاں
جس قدر طاقتیں بھی میّسر ہوئیں
سب اُسے سونپ بیٹھے......تو ڈرنے لگے
مانا ہو تو وَحشت بھری آنکھ کو کوئی پتھر خدا ہے!
گماں خوش ہوا......سر جھکایا
صفاتی مرکّب بنائے
ہزاروں برس تک بناتے، بڑھاتے رہے
حمد کا تخت جوڑا......اُسے لا بٹھایا

مگر مرد طاقت میں تھے...... سو اُسے بھی مذکّر رکھا!
دَست رَس میں نہ آجائے
اُس کو فلک پر بٹھایا
مگر آہ! مٹی...... کھلاتی، سلاتی، بچاتی ہوئی
ماں تو مٹّی تھی
مٹّی کو افلاک پر لے گئے
اور نادیدہ ہاتھوں سے جسموں کو بنتے ہوئے
دیکھنے میں مگن ہو گئے
اور مٹی نظر کو ترستی رہی!

جب برہنہ وہ غاروں سے نکلے
تو لاکھوں جتن منتظر تھے
پھلوں سے بھرا ایک جنگل جسے یاد کے
دور گوشوں کی تاریکیوں سے بلانا
اِرَم اور عدَن نام دینا تھا
اُس کو وہ خود کاٹنے لگ گئے
گھر بنے اور بستی بسی
پھر گھنے جہل کی تیرگی سے پرے
جاننے کا نیا پھل چکھا، آنکھ پردہ ہٹا

اور درختوں کے پتّے زمیں پر پڑے تھے!
درانتی کو پتھر میں دیکھا
یہاں سے وہاں گھوم کر چند دانے اکٹھے کیے
خود اکٹھے ہوئے
دائیں بائیں کو پرکھا
تو وہ آگے پیچھے کو ڈھکنے لگے
آنکھ اوپر ہی اوپر چلی جا رہی تھی
زمیں بھول کر آسماں یاد کرتے رہے
پھر گلے کی صداؤں کو آواز کر کے
انہیں نام، جذبے دیے
لفظ آغاز ہونے لگے
لفظ پھولوں کی صورت برسنے لگے
اک چمن کِھل گیا
جس کے اک شاخچے پر
ازل اور ابد بولتے تھے!
ابدتاب خوشبو میں لپٹے ہوئے لفظ چلنے لگے
ابتدا لفظ تھا...... اور خدا لفظ تھا!
بیج، پودوں میں ڈھلتے رہے
دھرتی ماتا کے سینے پہ پلتے ہوئے آدمی

دُور افلاک کی مہربانی کو مشکور کرتے رہے
پھر مذاہب کو جوڑا
جنہوں نے کہیں دور جا کر انہیں بانٹنا تھا
خدا کو زمیں پر اُتارا
اور اس کی رہائش کو پتھر اُسارے!

چار جانب ڈھلانوں سے رِستے ہوئے
اشک دھرتی کے گھاؤ میں بہتے رہے
کوہ سدِّ مقابل تھا
چیخے، بڑھے
تند ناگن کے مانند حملہ کیا
ایسی پھُنکار تھی
جو قدیمی زمانوں کے میدانِ پیکار میں
موت کی سنسناہٹ کے پہلو
رَجز خواں کی آواز میں گونجتی ہو
پہاڑوں میں پڑتی دراڑیں تھیں
اور کوہ کٹنے لگا
جب لرز کر گرا...... راستے میں پڑا

تو روانی کہاں
دم بہ دم پھیلتا جھیل ٹھہراؤ تھا!
اشک اونچے ہوئے
جوشِ گریہ! دباؤ بڑھا!
سامنے سنگ ہیں
گوشۂ چشم رِسنے لگا
اشک سیلاب تھے، بہہ پڑے
سنگ آنکھیں بہاتے ہوئے نوحہ گر بہہ پڑا
شوخ قوسِ تبسّم میں پلتے ہوئے
بے بصر زندگی کے طرب زا خیالو!
تعیُّش کے امروز میں سانس لیتی ہواؤ!
ذرا ہٹ کے بیٹھو
زمانوں کی آنکھوں سے رِستی ہوئی
غم کی تہذیب کے آشناؤ!
سَرکتے ہوئے میری آنکھوں میں آؤ
سنو! میں تواریخ کا نوحہ گر ہوں
مجھے اشک گننے کی تفویض ہے
آؤ مجھ سے سنو

کیسے لفظ اور پہیئے سے آغاز کر کے
دو پایہ خلا سے اجل پھینکنے لگ گیا!

جب زمیں کی زباں
آدمی کے نمک سے شناسا ہوئی
سرخ قطرہ برنگِ نشانہ گرا
میری تسبیح کا پہلا دانہ گرا
آسمانوں کی قاتل روانی کا ہتھیار...... پانی
تنفس کا آزار...... پانی
مجھے یاد آتی ہے پانی کی وہ حکم رانی
کہ جس میں سبھی خشک لکڑی بنے
موت پیتے ہوئے تیرتے تھے
میں گنتا رہا جب تُفنگ و تبَر
سرخ تصویر میں رعدِ سیمیں کا سیماب بھرتے تھے
چیخیں لہو رنگ تھیں!
وہ جو شہزادگی ورغلاتا رہا
چلتے پھرتے ہوئے
جا بجا تخمِ حکمت گراتا رہا

اُس کے چرنوں سے اکنافِ عالم میں
سرخی کی ڈوری پرونے کا اندھا جنوں چل پڑا
آدمی کا لہو
اَبلَقِ سیخ پا، فیلِ بدمست کے پاؤں پڑتا رہا
اور مشائی کی سب کتابوں کے اوراق خوں رنگ تھے!
میرے پہلو میں گریہ سلگنے لگا
وہ سِدھارتھ کے پالے ہوئے
شانتی حرف کاسے میں ڈالے ہوئے
جنگلوں میں جو نروان پانے گئے
راستے میں برہما کی تلوار سے آسماں پا گئے
دیکھتا تھا میں
اَن دیکھے حکموں پہ
کم زور ہونے کی پاداش میں
آفتیں ٹالنے کو
مظاہر پہ قربان ہوتی ہوئی ناریاں
ناریاں جو پتی دیوتا کی
پرائی چتاؤں میں ڈالی گئیں
بَین کرتے ہوئے

بے اجل، جل کے خاموش ہوتی رہیں!
وہ خدا جس کو دیکھا نہیں
اس کی اِک اِک صفت پر ہزاروں خدا تھے
جو ہنستے ہوئے
ننھے بچوں کی چیخوں میں ڈوبے ہوئے
خوں چڑھاوے کو مقبول کرتے رہے!
گِریہ واجب ہوا
جب میں دیوارِ گریہ بنا
تند گھوڑوں کے پیچھے گھسٹتے اسیروں کو سنتا ہوا
آتشیں خندقوں کی اجل بانٹتی تہہ میں
اُن لاڈلوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا
جنہیں اُن کے اپنے خدا نے
قبیلوں کے انبوہ سے چن لیا تھا
تو کافر فلک دور گم صُم فقط دیکھتا تھا!
صفات اُس کی قدرت میں رکھّی رہیں
وہ جو انسانِ عاجز کے خوابوں میں تھیں!
جس کی طاقت
کہ اِک لفظ سے ساری دنیائیں تخلیق کرلے

وہ خاموش تھا جیسے کرنی پہ قادر نہیں
خوف سے جس کی تخلیق کی تھی
وہ اب خوف کی اک علامت بنا تھا
اکیلا میں روتا رہا تھا
وہ رونے میں بھی ساتھ دینے کو اترا نہیں!

کیا کہوں
سب کو اپنے عقیدے میں لانا
رواں ضابطہ بن گیا
سو وہ تلوار کی نوک پر حکم لکھتے چلے
سارے منکر سروں کو اُڑاتے ہوئے
چار جانب کو لشکر چلے
دور و نزدیک تاراج کرتے رہے
آسمانوں پہ بیٹھے خدا میری دھرتی پہ لڑتے رہے
آگ اور خون کا کھیل کرتے رہے
دونوں جانب سے انسان مرتے رہے
وقت بہتا رہا
میں وہیں تھا

مجھے اَدھ کٹے جسم گننے کی تفویض تھی!

ریت سنتی نہیں
صرف آنکھوں سے چپ چاپ بہتی ہے
کہتی نہیں
اپنی جگہیں بدلتی ہے، مرتی نہیں
میں نے خیموں کی جلتی ہوئی اوٹ سے
وہ بدن گن لیے
جن کے سردار کا سَر سناں پر اچھالا گیا
تو وہ خورشید تھا!

کیسے بھولوں گا میں اُن بُریدہ سَروں کو
جو وَحشت کی تسکین کو بہرِ تفریح کاٹے گئے
جو الاؤ کے پہلو میں
آنکھوں میں حیرت لیے
اونچے مخروط بن کر کھڑے دیکھتے تھے!
زمانہ لہو کی طرح بہہ رہا تھا
مری آنکھ میں جل پڑا

جب وہ سورج پھٹا
موت چھتری سے بہتی ہوئی راکھ گرتی رہی
اور نسلوں تلک تابکاری نشاں ساتھ چلنے لگے
میری مالا کے دانے دھڑ ادھڑ گرے!
میں لکیروں کے کھنچنے کا ناظر ہوا
دونوں جانب کو خلقت گزرتی رہی
آدھی کٹتی رہی، آدھی جلتی رہی
آدھی ہوتی رہی، آدھی روتی رہی
دل کے میدان میں
میں نے مقتول جسموں کو جوڑا
فلک تک قطاریں گئیں!
دشتِ تاریخ کی سرخ برسات میں
میں نے خوں کی روانی کا نالہ کیا
میرے مجروح تن پر لگے زخم بھی خون روتے رہے
دور جاؤ!
تعیُّش کے اِمروز میں سانس لیتی ہواؤ!
مرا ہاتھ چھوڑو
خوشی کے چمکتے ہوئے لیس لفظو!

مجھے خون گننے سے فرصت نہیں ہے
میں تاریخ کا نوحہ گر ہوں
زمانوں سے مقتول گنتا رہا
انتقالِ شمار اُس کو کرنا ہے
جو میری آنکھوں سے بہتے ہوئے خون میں بہہ سکے
میں نے صدیاں گزاری ہیں روتے ہوئے
دل سمندر میں لاشیں ڈبوتے ہوئے!

ساربانو! شُتُر روک لو!
کاروانو! یہی دشت ہے
دائیں بائیں نہ آنکھیں مسافت کریں
تم مجھے دیکھ سکتے نہیں
میں تمہیں دیکھتا ہوں
یہی وقت ہے
بے نشانو! یہ تاریخ کا دشت ہے
سارے اُجڑے دیاروں کا مرگھٹ
یہی دشت ہے
آؤ گریہ کریں

اب ہمارے سفر کا یہی رخت ہے
راستہ سخت ہے
وقت دانو! یہی وقت ہے
نوحہ خوانو! یہی وقت ہے

نوحہ گر چل پڑا
بے خدائی کے صحرا میں نوحہ گری
ریت سر میں بھری
خاک پوشاک کی
دشت پیروں میں پہنا
دہائی! دہائی!
بہت قتل ہوتے رہے
لوگ میرے ترے نام پر
قتل کرتے رہے، قتل ہوتے رہے
ڈھنگ بدلے گئے، رنگ بدلا نہیں
تیرے چرنوں پہ چڑھتے چڑھاوے لہو رنگ ہیں
میں نے تجھ کو بنایا، مری بھول تھی
میرے دل سے نکل!

میرے سر سے اُتر!

آسماں گیر فریاد کی روشنی میں نظر آ رہا تھا
خدا......جس کی قرنوں تلک
چاند، تاروں، زمینوں پہ جبروت تھی
اُسکی طاقت سمٹنے لگی
شورِ نالہ بڑھا
کہکشانوں پہ چھائی نگہ داریاں پیچھے ہٹنے لگیں
اُس کے عظمت بھرے
اَن دِکھے تن سے اوصاف جھڑنے لگے
گردنیں اب اُلوہی گرفتوں سے آزاد تھیں
سانس چلنے لگے
آسماں کھل گیا
صاف دِکھنے لگا
شاہِ فطرت کو قابو کیا
تو عناصر سبھی ہاتھ باندھے ہوئے آ گئے
میری خدمت میں سجدہ کیا
آگ، پانی، ہوا، دھات، دھرتی، فضا اور خلا

میری سوچوں تلے آ گئے
وہ جو قاتل جراثیم تیری خدائی میں
تہذیبیں کھاتے رہے
تجربہ گاہ میں قید ہیں!
بستیوں میں نشاں تک نہیں

راستہ سخت ہے
لیکن اب میری باگوں کے نیچے مرا بخت ہے
آج انساں محبت، محبت خدا ہے
دِوانو! محبت خدا......
وقت دانو! یہی وقت ہے!

وقت زخمِ کہن اس لئے بھر رہا ہے
کہ دِل پر نئے زخم لگتے رہیں؟
میری آنکھوں نے آغاز ہونے کے لمحے سے
جو ہر کے سینے میں جلتی ہوئی آگ دیکھی ہوئی ہے
بھڑکنے نہ پائے!
مجھے علم ہے، راکھ ہو جائیں گے
سب زمین وزماں......سب مکین ومکاں

پھر مجھے منتظر بیٹھنا ہوگا
پیچیدہ ہوتی ہوئی اتنی انواع میں
کون جوڑا قدم ایک اوپر دھرے
سوچنے کا پھر اک بار آغاز ہو!

نوحہ گر اک صدا
خامشی ......اور معدوم تھا
ایک جمتا ہوا جسم پتھر ہلا
ڈھونڈتا تھا صدا
اب جو معدوم تھی
لوگ خوشیوں کو بھاگے
کسی ہاتھ میں نوحہ گر کا قلم
خونِ آدم کی تاریخ لکھتا رہا
ہر ورق پر لہو جھلملاتا رہا

میں قدیمی ہوں مجھ سے سنو...

یہ نظم...

شہزاد نیّر کی طویل نظم ''نوحہ گر'' ان کے اندر رچے بسے تاریخی اور عصری شعور کا باکمال شاعرانہ اظہار ہے جس میں انہوں نے کمال مہارت سے 'بے قید' وقت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ سچ کہوں تو شہزاد نے سائنس کو رومانس بنا دیا ہے اور اُردو زبان کی کم مائیگی کے باوصف یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔

یہ نظم کہانی ہے نیستی سے ہستی ہونے کی اور پھر اس ہستی کے بستی بسانے کی، خوف کی زمین سے دیوتاؤں کی فصل اگانے اور دیوتاؤں کو ایک خدا میں سمانے کی اور پھر آباد بستیوں کو مذہب کے نام پر برباد کرنے کی۔ یہ المیہ ہے زمین و زمان کا جس کی جڑیں ہم آج بھی آسمان میں ڈھونڈنے پر تلے ہیں۔ آسمان ...... کہ جو محض آنکھ کا گمان تھا اسے مقدس صحائف نے 'یقینی بیان' کے مقام پر براجمان کیا مگر اب تصورِ فلک علمی تحقیق کے میدان میں بے امان ہے۔

یہ نظم محض ادب کا چسکہ رکھنے والوں کی بجائے ادب کے سنجیدہ قارئین سے مکالمہ کرتی ہے۔ 'نوحہ گر' اپنے اسلوب اور خاص طور پر نفسِ مضمون کے لحاظ سے ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

سعید ابراہیم

طویل نظم ''نوحہ گر'' پر ایک تنقیدی نظر

شہزاد نیّر کی تخلیقات ایک تسلسل سے میری نظر سے گزرتی رہی ہیں اور میری کوشش رہی ہے کہ میں اس کی تخلیقات کو اس کی شعری شخصیت کے کل کی روشنی میں رکھتے ہوئے تجزیاتی عمل سے گزارتا رہوں اور یہ دیکھنے کے جتن کرتا رہوں کہ کب، کہاں اور کیسے اس کی تخلیقات اس کی شعری شخصیت سے ضویاب ہوتے ہوئے خود شخصیت کی وسعت پذیری میں معاون ہونے لگتی ہیں

شہزاد نیّر کو میں فکر اساس شاعر سمجھتا ہوں۔ یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ ''فکر اساس'' شاعری کو ''تجربہ اساس'' شاعری سے مختلف اور الگ تصور کرنا چاہیے۔ کیونکہ فکر اساس شاعری تجربے کو اپنی کسوٹی پر پرکھے بغیر تخلیقی عمل کے سپرد نہیں کرتی۔ فکر اساس شاعری جلوہ نما کثرت میں کسی پنہاں وحدت کا سراغ ضرور دے جاتی ہے جس تک رسائی کے بعد مفرد تخلیقات کے مختلف رنگ منکے ایک تار میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ شہزاد نیّر کی شاعری میں جلوہ نما کثرت مجھے ہمیشہ کسی پنہاں وحدت کی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔ اس پنہاں وحدت کو اب تک اگر میں کسی ایک لفظ میں سمو سکا ہوں تو وہ لفظ ''تشکیک'' ہے۔ وہ اپنے اردگرد موجود تعینات، تعقلات، توہمات اور اعتقادات کو اپنی تشکیکی فکر کی میزان پر پرکھتا رہتا ہے اور یہی تشکیک اس کا تخلیقی محرک بنتی ہے۔ مجھے اس کی نظموں کے مختلف رنگ منکے اسی تار میں پروئے لگتے ہیں۔

طویل نظم استعاروں کی تخلیق کے پس منظر میں فکر کی بہ طور اساس موجودگی کا جو بنیادی تقاضا کرتی ہے اُس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا اور عموماً وہی تخلیق کار طویل نظم کہنے کی جانب تخلیقی رغبت محسوس کرتے ہیں جن کا فکری وژن مختصر نظموں میں سمٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔

شہزاد نیّر کی زیر تجزیہ نظم اس کی دوسری طویل نظم ہے۔ یہاں یہ بات میرے لیے باعث حیرت ہے کہ اس نے اپنی پہلی طویل نظم ''خاک'' کو تعمیریت کے بجائے تخلیقیت کے ذریعے قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس نظم میں تعمیریت اور تخلیقیت کے تعاملی تناسب میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں تھا لیکن تخلیقیت کی مقدار تھوڑی زیادہ ضرور تھی۔ البتہ اس دوسری نظم ''نوحہ گر'' میں اس کا رویہ خاصا مختلف ہے۔ یہاں تعمیریت کی مقدار تخلیقیت کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی یہ نظم ارتباط اور انتظام میں پچھلی نظم کے مقابلے میں سبقت حاصل کیے ہوئے ہے۔ یہ نظم خود کو استعاروں کے وفورِ تخلیق کے برعکس فکر کے تشکیکی محرّک کے زیر اثر پڑھواتی ہے۔ یہ پوری نظم تشکیکی فکر کے زیر اثر پروان چڑھنے والے World Outlook (جسے میں کائناتی نظر کہتا ہوں) کے تناظر میں مذہبی اعتقادات کا محاسبہ پیش کرتی نظر آتی ہے اور انسانی خون ریزی کے پس منظر میں سبب کے طور پر مذہبی اعتقاد کی موجودگی ثابت کرتی ہے۔

اپنے اس بنیادی تھیسس کو پیش کرنے کے لئے یہ نظم سائنسی تعقلات کے تناظر میں تخلیقِ کائنات کے عمل سے آغاز کرتی ہے اور اس کے بعد اساطیر کی روشنی میں، انسانی تہذیبی سفر کو کہیں سائنسی، کہیں مادی جدلیت اور کہیں خالص تخیلاتی تناظر میں شعری قالب میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور استعارے اپنی معنویت کو اسی فکری پس منظر کی تحدیدات میں ڈھالتے محسوس ہوتے ہیں۔ اس نظم کی استعاراتی لسانی تشکیل کس طرح فکر بلکہ مکتبِ فکر سے ضویاب ہوتی ہے اس کا تجربہ الگ مطالعے کا متقاضی ہے البتہ نظم میں بعض مقامات پر انسانی تہذیب کی انتہائی اہم کروٹوں کو جس اختصار اور شعری ایمائیت کے ساتھ جزوِ نظم بنایا گیا ہے اس کا ذکر نہ کرنا بددیانتی ہو گی۔ بالخصوص ستر پوشی، جنسی جبلت اور تخیل کے اولیں احساسات کے ادراک کو جس طرح صرف دو دو مصرعوں میں سمیٹا گیا ہے وہ شاعر کی ہنر

مندی پر نا قابلِ تردید دلالت کرتا ہے۔

پوری نظم میں شاعر ایک کردار کے طور پر موجود دکھائی دیتا ہے جس کی آنکھیں جگہ جگہ انسانی غم سے نم ناک ہو جاتی ہیں مگر شاعر کی شخصیت میں متشکک کی موجودگی غم کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس جبر کا تاریخی جبر کے تناظر میں دستیاب علوم کی وساطت سے تجزیہ کرتی چلی جاتی ہے اور اس سبب تک رسائی حاصل کرتی ہے جسے اس جبر کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ماخذ کو نظم ''خدا'' کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

یہ نظم خدا کو ایک ایسا لفظ قرار دیتی ہے جس کے گرد پہلے انسان خود عقیدے اور عقیدت کا ہالہ بناتا ہے اور پھر اس عقیدے اور عقیدت کی آڑ میں زر اور زمین کی ہوس میں ''انسانی بقا'' کے ساتھ وہ جابرانہ اور سفاکانہ کھیل کھیلتا ہے جسے تاریخ اپنی تمام کوششوں کے باوجود دبانے اور چھپانے میں ناکام نظر آتی ہے۔ یہ کردار بیک وقت قدیمی بھی ہے اور نوحہ گر بھی۔ اس کی ایک حیثیت متشکک ناظر کی ہے اور دوسری شاعر کی۔ ایک برابر تجزیئے میں مصروف ہے اور دوسری برابر ماتم میں۔ اس دوہری کیفیت نے پوری نظم کے تار و پو کو تشکیل دیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظم کا فکری مواد شعری قالب میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے۔ نظم لاوجودیت سے موجودیت اور قنوطیت سے رجائیت کی طرف سفر کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ نظم میں رجائیت کی اساس سراسر ''علم'' کو قرار دیا گیا ہے جس میں اُس کی ابدی مسرت اور ازلی مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔

اس نظم کی اہمیت کسی نئے سوال کی اختراع یا اُس کے جواب کی دریافت میں نہیں ہے بلکہ نظم کا کام کثرت کو ایک نئی وحدت میں منقلب کر دینا ہے اور یہ کام اس نظم نے بہ حسن وخوبی سرانجام دیا ہے اس لیے یہ نظم پڑھے جانے بلکہ بغور پڑھے جانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

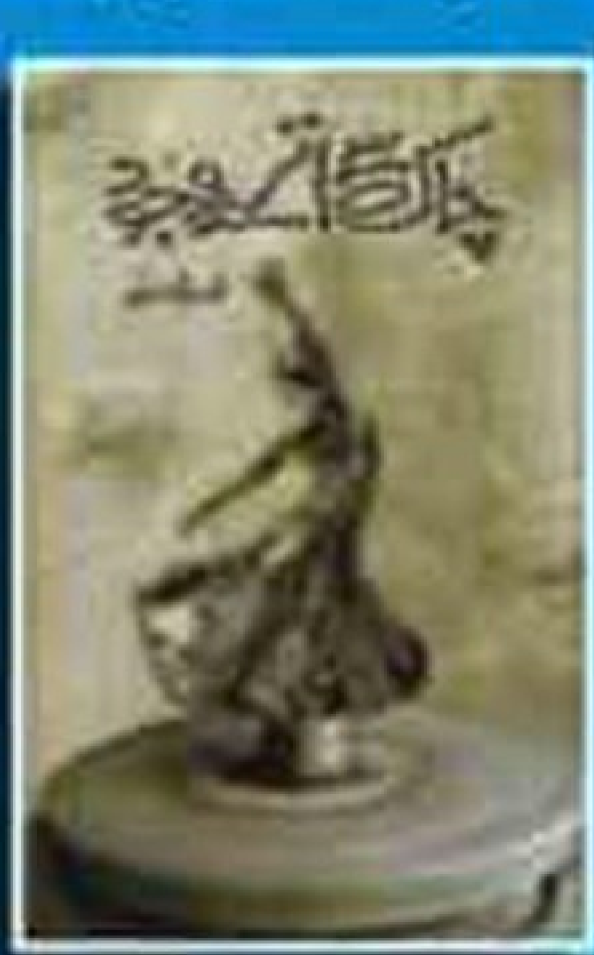
(ایک طویل تر مضمون سے مُلخّص)

دانیال طریر



برقاب

(2006 PEN ایوارڈ)



چاک سے اترے وجود



مجھے میرا ادھورا پن بھیجیں

آؤ ادھر سے روشنی اٹھاؤ

وہی منظر اپنا کر رہو جو میں نے سوچ رکھا ہے

اٹھاؤ کیمرا اس کے بعد دیکھو!

فقط اتنا اتارو جس قدر میں چاہتا ہوں

کیا؟

اسے لکھا ہوا ایسے کیسے پڑھتے

اور اداکاری تو ایسی ہو

کوئی بھی دیکھے تو ایسا ہی لگے

کہ جو کرتے ہو وہ پہلے سے لکھا جا چکا ہے...

([illegible] سے اقتباس)